# اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا ترجمان

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

**اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا ترجمان**

# اقبال ریویو

جلد (۱۲) نومبر ۲۰۰۳ء شمارہ (۲)

ISBN.81-86370-24-2

## مجلس مشاورت

۱۔ پروفیسر سید سراج الدین (صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (پنجاب یونیورسٹی لاہور)

۳۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی یونیورسٹی)

۴۔ جناب زکریا شریف (ممبئی)

## مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد

۲۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر

۳۔ جناب وجیہ الدین احمد

۴۔ سید امتیاز الدین


## بدل اشتراک

فی شمارہ ۳۰ روپے دو شمارے ۵۰ روپے، بیرونی ملک فی شمارہ، ۴ ڈالر


خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔حیدرآباد۔500028

آندھرا پردیش (انڈیا)۔فون:55663950

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد صلاح الدین، محمد کلیم محی الدین، ''شارپ کمپیوٹر'' محبوب بازار، چادر گھاٹ حیدرآباد۔۲۔فون:55704044

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلیشر نے وی جی پرنٹرز لسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

# اداریہ

اقبال ریویو کا زیر نظر شمارہ اہم مضامین پر مشتمل ہے۔ظ انصاری کی کتاب ''اقبال کی تلاش'' (مطبوعہ ۱۹۷۸ء) پر ایک جامع تبصرہ جناب محمد مصلح الدین سعدی نے تحریر کیا تھا جو ''اقبالیات سعدی'' کی اشاعت کے بعد ہمیں دستیاب ہوا، تلاش اقبال میں ظ انصاری کی یافت پر فکری محاکہ اور تجزیاتی تحسین کے علاوہ اس مضمون میں سعدی صاحب نے ان مقامات کی طرف بھی اشارے کئے ہیں جہاں ظ انصاری، اقبال کی تلاش میں کہیں کہیں بھٹکتے سے نظر آتے ہیں۔
بچوں کے لئے اقبال پر لکھی گئی نظمیں ان کے مطبوعہ کلام میں شامل ہیں، لیکن بعض ایسی عمدہ، سلیس اور سبق آموز نظمیں بھی ہیں جن کو اقبال نے اپنے مجموعہ کلام میں شامل نہیں کیا تھا۔اقبال کے لئے بچوں کی نظمیں کے موضوع پر ان نظموں کا جامع انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف اعظمی نے دو معاصرین اقبال اور ایلیٹ کی فکری مماثلتوں کو اپنے تقابلی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔نامور سائنس داں پروفیسر یم یم تقی خاں کی دو تقاریر شایع کی جارہی ہیں۔عصری سائنسی موضوعات پر جہاں پروفیسر صاحب کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے، وہیں حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ان موضوعات کا وہ تجزیہ کرتے ہیں۔اقبال کے اشعار کے حوالہ سے اس مطالعہ میں ہمیں نئی جہتوں کا سراغ ملتا ہے۔ممتاز شاعر مخدوم محی الدین کی اقبال پر نظم خود شاعر کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہمیں محترم سری نواس لاہوٹی نے عنایت کی تھی۔یہ نظم عکس تحریر کے ساتھ بطور یادگار پیش کی جارہی ہے۔اس کے علاوہ مخدوم صاحب کے ایک مضمون ''مجاہد اقبال'' کا اقتباس بھی بطور یادگار شایع کیا جارہا ہے (جو سب رس اقبال نمبر ۱۹۳۸ء میں شایع ہوا تھا)۔

شہرۂ آفاق اسکالر پروفیسر اناماری شمل پر ایک گوشہ اس شمارہ میں مختص کیا گیا ہے۔اس مختصر لیکن جامع حصہ میں پروفیسر شمل کی بلند پایہ شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے علمی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔یہ گوشہ پروفیسر سید سراج الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب اور پروفیسر عصمت مہدی کے مضامین سے آراستہ ہے۔پروفیسر شمل کی حیدرآباد میں آمد کے موقع پر اکیڈیمی میں ان کی تقاریر کے تذکرہ کو جناب محمد ظہیر الدین نے اختصار کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیوں پر مشتمل ایک مختصر جائزہ کے سلسلہ کو جاری رکھا گیا ہے۔ان مساعی کو مستحکم کرنے کے لئے قدردانِ اقبال کی توجہ کی ضرورت ہے۔

سید امتیاز الدین

# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | اداریہ | | |
| ۲ | ظ صاحب اقبال کی تلاش میں (مطالعہ کا ایک تاثر) | مصلح الدین سعدی | ۵ |
| ۳ | بچوں کے لئے اقبال کی نظمیں ۔ ایک مطالعہ | سید امتیاز الدین | ۱۷ |
| ۴ | دو معاصرین ۔ اقبال اور ایلیٹ | ڈاکٹر یوسف اعظمی | ۳۶ |
| ۵ | ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں | پروفیسر یم یم تقی خاں | ۴۵ |
| ۶ | یہاں کارواں اور بھی ہیں | پروفیسر یم یم تقی خاں | ۵۱ |
| ۷ | اقبال کو مخدوم کا منظوم خراج عقیدت | (مخدوم کا عکس تحریر) | ۵۷ |
| ۸ | اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیاں | ادارہ | ۶۱ |


## گوشہ انا ماری شمیل


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | پروفیسر انا ماری شمل کی تحریروں کا عکس | | ۶۵ |
| ۲ | انا ماری شمل کی یاد میں | پروفیسر سید سراج الدین | ۶۹ |
| ۳ | شمل کی ایک نظم کا ترجمہ | پروفیسر سید سراج الدین | ۸۰ |
| ۴ | انمیری شمل | ڈاکٹر محمد ضیاء الدین شکیب | ۸۱ |
| ۵ | اقبال اکیڈیمی میں پروفیسر شمل کے لکچرس | مرتب: محمد ظہیر الدین | ۸۶ |
| ۶ | Annemarie Schimmel on Deciphering The signs of God | پروفیسر عصمت مہدی | ۸۹ |

مصلح الدین سعدی

# ظ صاحب ''اقبال کی تلاش میں''

## (مطالعہ کا ایک تاثر)

[ ڈاکٹر ظ انصاری کی کتاب ''اقبال کی تلاش'' مطبوعہ ۱۹۷۸ء کے بارے میں جناب مصلح الدین سعدی مرحوم نے میں اپنے تاثرات تحریر کئے تھے۔ یہ مضمون ہمیں پچھلے شمارہ اقبالیات سعدی کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوا' جواب پیش خدمت ہے (ادارہ) ]

.....

ظ صاحب ''جہانِ اقبال'' کے ایسے کولمبس ہیں جن کے پاس ''زادِ سفر'' بھی ہے۔ وسائل سفر بھی ہیں اور سفر کا مقصد بھی ہے ہر چند کہ انہیں ''دریافت'' کا ادعا نہیں۔ وہ اپنے اس علمی سفر کو صرف تلاش کا نام دیتے ہیں' لیکن اس تلاش میں ''سفر در وطن'' کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے..... اور جب کسی کا وطن ہی سفر بن جائے تو ''راہِ سلوک'' بہ آہے گا ہے طے نہیں ہوتی' فرماتے ہیں۔

> ''عقیدوں اور ازموں کی گردش رنگ کے ساتھ جب بھی اقبال کو دیکھا بدلا ہوا پایا۔ کبھی لگن بڑھی' کبھی الجھن' دونوں کو بڑھانے والا ادب' اقبالیات کے ذخیرے میں موجود تھا۔ تلاش جاری رہی۔
>
> پتہ چلا اقبال ''مقامات'' کے شاعر ہیں۔ ادب کا عاشق اِن کے جادو میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہاں یہ ہے کہ خود بعض مقامات سے گذرے یا درگذر کرے تب اُن سے ملے۔ یہی کیا اور بالآخر دل آکر یہاں ٹھہرا.....''

ظ صاحب کا دل ''جہاں'' آکر ٹھہر گیا ہے' اُسی مقام کی تفصیل ان کی تازہ کتاب ''اقبال کی تلاش'' میں بڑے سلیقہ کے ساتھ تیرہ مضامین میں جو بہ ظاہر مختلف اور بہ باطن ایک دوسرے سے مربوط ہیں ملتی ہے۔

مضامین کی فہرست (اظہار کی سہولت کے مدِ نظر) یوں ہے۔

''اقبال اور ہم'' اقبال کی زندگی کا پہلے دوسرے تیسرے اور آخری دور پر محیط سوانحی مواد' شعور کے چار سرچشمے' بمبئی میں چند روز، اقبال اور جرمنی' شان جلالی اور شان جمالی' فراق و

وصال' قلندر کا لہوترنگ' ردوقبول کا معاملہ اور تصوف کا تاریخی رول ۔ اِن مضامین کے علاوہ کتاب کے آغاز میں ''پہلا قدم'' کے عنوان سے اپنی تلاش وجستجو پر دو صفحات پر مشتمل ایک مختصر سا مضمون بھی لکھا ہے جس کے چند جملے اوپر درج کیے گئے ہیں ۔ میری دانست میں یہ تلاش کی روداد کا حرفِ آخر ہے جو سب سے آخر میں لکھا گیا ہوگا...... چوں کہ ظ صاحب کی تلاش ابھی جاری ہے اس اعتبار سے ''اقبال کی تلاش''...... شاید ان کا پہلا قدم' ہو اُردو دنیا ظ صاحب کے اگلے اقدامات کا یقیناً انتظار کرے گی۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ......

اقبال کی طرح خود ظ صاحب کی تلاش کوئی آسان کام نہیں ۔ اقبال کی طرح ظ صاحب بھی دور سے سطحِ سمندر پر اُبھرا ہوا کوئی نقطہ نظر آتے ہیں ۔ حوصلہ مند شناور موجوں کا سینہ چیرتا جوں جوں قریب ہوتا جاتا ہے اس نقطہ کی وسعتوں کا اندازہ ظ صاحب پھیلنے اور سکڑنے کے کم البتہ ڈوب کر سراغ لانے کے زیادہ قائل معلوم ہوتے ہیں ۔ ماہر غواص کی طرح وہ اُس وقت تک تلاش جاری رکھتے ہیں جب تک کہ گوہر مراد ہاتھ نہیں آجاتا...... جب وہ گوہر مراد اپنی تلاش کے نتیجے میں پالیتے ہیں تو انہیں صدف سے نکال کر اپنے اسلوب کے خوبصورت ڈبوں میں سجا کر ایک ماہر جوہری کی طرح دیدہ وروں کے سامنے پیش کرنے کا ڈھب بھی جانتے ہیں ۔ اُن کے اظہار کے تار و پود بظاہر سادہ نظر آتے ہیں ۔ لیکن یہ سادگی اِس قدر دل فریب ہوتی ہے کہ بانکپن اور سجاوٹ کے صد رنگ اِس کے آگے ماند پڑ جاتے ہیں ۔ ان کی سیدھی سادی صاف اور واضح نثر پیچیدہ مسائل اور نازک ترین خیال کو اِس وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے کہ گل معنیٰ مہک اٹھتے ہیں ۔ خیال کی خوشبو ہو کہ افکار کی مہک ان کے قلم میں جوں کی توں موجود بھی ہے اور فضائے علمی کو معطر بھی کر رہی ہے...... یہ قلم کے دھنی بھی ہیں اور غضب کے پارکھ بھی ۔ ان کے استدلال میں منطق نہیں تخلیقی شان جلوہ گر ہوتی ہے اور کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ سجے سجائے علمی سلاطین کے قصر کی گنبدوں سے پرے کسی اُونچی چٹان پر اپنا خیمہ لگائیں...... مختصر یہ کہ ان کا اسلوب بیان سورج کی کرنوں کی طرح روشن' سبک خرا ندی کی طرح رواں اور گہرے سمندر کی طرح عمیق بھی ہوتا ہے...... دیکھنے میں آسان لیکن نقل کرنے کی کوشش کیجیے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خواہ مخواہ منہ بنا کر چڑانے کی کوشش کر رہا ہے...... ان کی شخصیت ان کی انفرادیت' ان کے مشاہدات کی ساختہ اور پرداختہ ہے اور وہ سارا مواد جو خشک و تر' تلخ و ترش حادثات کی شکل میں زمانہ کی تصویر بنا

ہوا ان کے قوی حافظے میں محفوظ ہے۔ اِن کے مطالعے پر بھی اثر انداز ہے۔ معروضی پیرہن کی کاٹ جدلیاتی ہے ..... تجرباتی علوم ہوں کہ نفسی احوال وہ اپنی انفرادیت سے دامن کشاں نہیں ہوئے۔ ان کی انا میں انکساری بھی ہے اور تسکین انا کے لئے قطعیت کے ساتھ مثبت اظہار بھی ..... منفی انداز کے طور طریق ان کو نہیں بھاتے یہی وجہ ہے کہ ان میں صداقت انکار کے ساتھ ساتھ اپنی آگہی کے اظہار کی جرأت بھی ہے۔

جس طرح اقبال کی تلاش میں ظ صاحب نے تنقید کے ادبی ضابطوں سے تھوڑی بہت بے تکلفی برتی ہے' میں نے بھی اس مطالعے میں سکّہ بند اُصولوں سے انحراف ضروری سمجھتے ہوئے اقبال کی تلاش'' کے وسیلے سے ظ صاحب کو تلاشنے کی سعی کی ہے ..... ظ صاحب کے اسلوب پر اُن کے اظہار پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ''اقبال کی تلاش میں'' ظ صاحب اپنی فکر اور فن کے نقطۂ عروج پر نظر آتے ہیں' اقبال سے ان کا اتفاق بھی اُصولی ہے اور اختلاف بھی۔ وہ وضاحت کے ساتھ اپنے اخذ کردہ نتائج کو پیش کرتے ہیں بلکہ ان نتائج کے پس پردہ' جو محرکات ہیں اُن کی بھی نشان دہی ضروری سمجھتے ہیں۔ حیات اقبال کے اہم گوشے اقبال کے عصر کے پس منظر کے ساتھ اُن کے دسترس میں ہیں۔ ظ صاحب چوں کہ حیات، کائنات اور سماجی انقلابات کی توجیہہ مادّی بلکہ مارکسی نقطہ نظر سے کرتے ہیں اِس لئے ''اقبال کی تلاش'' میں ان کا روّیہ اور اِن کے فیصلے چونکا دینے والے بھی ہیں اور فکر انگیز بھی۔

ظ صاحب کے تجزیے اُن کے سائنٹفک ذہن کے اختراعات فائقہ کی حیثیت ہی نہیں رکھتے بلکہ سلسلۂ روز و شب کے احوال اور اعمال میں تپے ہوئے ایک دردمند دل کی صدا بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دل جو سارے بنی انسان کے اہم فکری دھاروں کی بھٹی میں تپ کر یہ آب و رنگ لایا ہے جب اقبال کی تلاش میں نکلتا ہے تو قدم قدم پر سوالات پیدا ہوتے ہیں' وہ کچھ چیزوں سے اختلاف کرتا ہے' کچھ چیزوں سے اتفاق۔ ظ صاحب کے اِس اتفاق اور اختلاف سے مطالعۂ اقبال میں مدد ملتی ہے۔ ظ صاحب کے اس پہلو کو آیئے ذرا تفصیل کے ساتھ اُن کے مضامین میں جھانک کر دیکھیں۔ پہلا مضمون ہے۔

''اقبال اور ہم''

دیکھنا یہ ہے کہ مضمون کے عنوان ''اقبال اور ہم'' میں جو ہم کی ضمیر استعمال کی گئی ہے وہ کس طرف راجع ہے۔ اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تو اس ضمیر کو ہم ہندوستانی، ہم مسلمان بلکہ ہم

اُردو والے یا ہم انسان کی طرف مربوط کر سکتے ہیں۔ جیسے دکن کے مشہور شاعر مخدوم محی الدین کی ایک مشہور نظم میں 'ہم' کا استعمال ہوا ہے۔

ہم افرنگی ہم امریکی ہم چینی جانبازان ِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن، آہن پیکر، فولاد بدن

جب اس سوال کے واضح جواب کے لئے اس مضمون پر نظر ڈالتے ہیں تو خود ظ صاحب کے یہ جملے بھی ہماری معاونت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں' فرماتے ہیں:

''شعر میں آنچ آئی تو دہکتے ہوئے سماجی یا (اجتماعی) شعور کے ساتھ آئی اور بڑھی بھی اسی کے ساتھ ساتھ یہ شعور جیسے جیسے ان کے رگ و پے میں سماتا گیا۔ ان کے ''میں'' کو 'ہم' بناتا گیا۔ کلام کی تاثیر بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ میں اور ہم کا امتیاز اُٹھ گیا''۔ میری دانست میں ظ صاحب کا سماجی شعور اب ان منزلوں میں ہے جہاں میں ہم بن جاتا ہے اور غالب کا یہ مصرع ظ صاحب کی صورت حال کا واضح اظہار بھی ہے۔:

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

ظ صاحب نے اس مضمون میں بڑی کام کی باتیں بتائیں۔ سلسلہ وار شمار کریں تو ان کی یہ صورت ہوگی۔

۱۔ ابتدائے شعور سے ہی اقبال کے دل میں سماجی حالات کی پھانس چبھنے لگی تھی۔

۲۔ ذاتی' بالکل ذاتی زندگی کا دُکھ سکھ ثانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

۳۔ اقبال نے اپنے خیالات کے نقشے پر جس قسم کے مثالی سماج کی تعمیر سوچی تھی وہ نہ تو بنا نہ آئندہ بنتا نظر آتا ہے۔

۴۔ کاروان کے کوچ کی پکار تھکے مسافر کی صدا نکلی۔

۵۔ فرد یا شخصیت کی تعمیر کے لیے جو کچھ مال انھوں نے فراہم کیا تھا آج سیاسی آزادی کے ماحول میں اس کی قدر و قیمت اور اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔

۶۔ مستقبل کی ترقی یافتہ دنیا بنانے سجانے کے لئے جس قماش کا اور جس بل بوتے کا آدمی وہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ آدمی ہمارا اور اقبال کا آئیڈیل ہے۔

۷۔ اقبال کے تمام تر ورثہ میں ان کے تصور کا وہ فرد ہم چن لیتے ہیں جو حاضر وموجود سے نا مطمئن بھی ہوگا اور اس پر ایک اضافہ بھی۔ خاص ان ہی معنوں میں وہ بہتر یا برتر انسان کی راہ ہموار کرنے والے شاعر ہیں۔

ان باتوں پر کسی تبصرے کی گنجائش نہیں ہے کہ ظ صاحب نے واشگاف الفاظ میں اپنے ''ہم'' کے موقف کی وضاحت کردی ہے۔ ان جملوں کی روشنی میں ان کے ''ہم'' کا تعین ہو جاتا ہے اور جب وہ یہ کہتے ہیں:

''اشتراکی حلقوں میں اقبال اپنے اسی کلام کی بدولت چاہے اور اپنائے گئے تو اس ''ہم'' کی طرف سے اعتذار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال جیسے ''رجعت پسند'' کو ترقی پسند حلقوں نے کیوں سینے سے لگایا تھا ان کے اسباب وعلل کی وضاحت ظ انصاری کے قلم سے برمحل بھی ہے اور سچی بھی۔ ظ صاحب نے اعتراف کے طور پر یہ بھی کہا ہے ''خاص کمیونسٹ حلقوں میں اقبال پر کتنی ہی نکتہ چینی ہوتی رہی مگر ترقی پسند شاعری اور شاعروں کو اس کے سوائے چارہ کار نہ تھا کہ وہ اقبال سے فیض اُٹھائیں۔ یہاں حیرت ہوتی ہے کہ اقبال بقول ظ صاحب کے نہ بالشویزم سے واقف تھے نہ انہوں نے مارکس اور اینگلز کا مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی تاریخ کی مادی تعبیر والے فلسفہ کی روشنی میں اس لائق تھے کہ ہمالہ کے اس طرف روس میں وقوع پذیر ہونے والے حالات کا صحیح اندازہ کر سکتے۔ مگر ظ صاحب یہ ضرور کہتے ہیں کہ ماہ وسال گزرنے کے ساتھ ساتھ روس کی گرمئی گفتار سے ان پر قوموں کی روش کھلنے لگی۔

اقبال جو یوروپ میں ساڑھے تین برس گزار کر بھی مارکسی نظریات کے اثر ونفوذ سے بے نیاز گزرے تھے' چوں کہ اُمید بھری نظروں سے ہمالیہ کے بلکہ اپنے ذہنی اُفق کے اس پار تک دیکھنے لگے:

آفتابِ تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ظ صاحب نے اشتراکیت کو اقبال کے ذہنی اُفق سے آگے کی چیز بتایا ہے۔ یقیناً اقبال کو اشتراکیت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انقلاب روس کے بعد ۱۲ برس وہ زندہ رہے۔ انقلاب روس اگر تاریخ عالم کا کوئی چھوٹا سا واقعہ ہوتا تو شاید اقبال کی عدم واقفیت کا سوال پیدا ہوتا۔ ظ صاحب نے ''اقبال کی تلاش'' میں جگہ جگہ ان کے علمی پس منظر اور مشرق ومغرب کے ان تمام سوتوں کا

ذکر کیا ہے جن سے اقبال گزرے اور ناواقف رہے تو صرف اشتراکیت سے :

سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

اگر ہم یہ کہیں کہ ظ صاحب کا وہ اسلوب جس کے بارے میں کسی بھی پڑھے لکھے شخص کی دو رائیں نہیں ہو سکتیں ہم کو پسند ہے لیکن اگر ہم اپنے مطلب کی ان باتوں کو لے لیں جو ہمارے نظریات و عقائد سے ہم آہنگ ہیں اور باقی جو کچھ ہے وہ ظ صاحب کے لئے چھوڑ دیں تو کیا ظ صاحب کے فکر و فن کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے اور جبکہ یہ عالمگیر اصول بھی خود ظ صاحب کے قلم سے واضح ہو رہا ہے کہ ''تھکن کسی نہ کسی مرحلہ پر ایک نظر اور نظریہ کا مقدر ہے۔'' اقبال کی تلاش میں'' ظ صاحب کا یہ پہلا قدم کیا کسی تھکن کا اعتراف نامہ ہے یا پھر گردش زمانہ نے عقیدوں اور ازموں کی ایسی ایسی شکلیں بنائی ہیں کہ ساری پیش قیاسیاں اور پیش بینیاں سر بگریباں ہیں اور تھکا ہوا انسان کسی فرار کے صحرا کی جانب نگراں ہے۔

ظ صاحب کا یہ خیال یقیناً کسی فراریت کا آئنہ دار نہیں ہے کہ اقبال ہمارے لئے صرف بڑے شاعر ہیں نہ ان کا ہر اک پیغام ہمیں گرماتا ہے نہ ان کا آئیڈیل ہمارا آئیڈیل ہے لیکن جیسا ہوتا آیا ہے بڑی آنکھوں کو دیکھ کر آنکھیں بڑی ہوتی ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص نے ہمالیہ کے اُس پار طلوع ہونے والے سرخ سورج کو نہیں دیکھا تھا کیا اس کو آنکھ والا کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی بڑی آنکھوں والا؟؟؟۔ اقبال کے ساتھ چلنے کے دعوے دار بھی ہیں اور انہیں اقبال کی تلاش بھی ہے۔ اس سفر میں ہم بھی ظ صاحب کے ساتھ ہیں:

می نگریم و می ردیم

دوسرا مضمون ''شعور کے چار سرچشمے'' اس جملے سے شروع ہوتا ہے'' اقبال ہماری زبان کا سب سے باشعور اور بیدار فن کار تھا۔ سچ پوچھئے تو بیسویں صدی میں اُردو فارسی ادبیات نے اس ایک شاعر کی بیداری کی برکت سے ایک صدی کا فاصلہ طے کیا اور اُردو عالمی پیمانے کے مسائل حاضرہ سے دوبدو بات کرنے کے قابل ہوئی''۔

ظ صاحب کی دانست میں شعور کے چار سرچشمے یہ ہیں۔

۱) مسلم پنجاب و کشمیر

۲) ہندوستان کا تہذیبی رینا ساں اور قومی آزادی کی تحریک
۳) جرمنی (بسمارک کے بعد) اور جرمن کلاسیکی فلاسفی
۴) یوروپ اور مغربی سیاست کے مثبت و منفی نتائج

اقبال کے شعور کو ظ صاحب نے اس درجہ بندی کے ذریعے اس حد تک جکڑنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام جوان کے شعور کا اصلی سرچشمہ ہے اقبال کے فکری ارتقاء کی تاریخ میں دب کر رہ گیا۔ وحدت الوجود اور وحدتِ شہود پر مشتمل مختلف شارحین اقبال کی آراء کو درج کر کے اقبال کے بارے میں جو متضاد قسم کی باتیں کہی جاتی ہیں' ان کو نمایاں کیا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں:

''اس صورت حال کے باوجود ہم اقبال کی چالیس برس کی کمائی کو مجموعہ اضداد نہیں کہہ سکتے۔ وقت کی ترتیب اور مختلف اثرات کی سراغ رسانی اور احتیاط کے ساتھ چن کر دیکھئے تو ان میں مسلسل حرکت، مسلسل جستجو کا عمل دخل نظر آئے گا''۔

اقبال کے بارے میں واضح طور پر ان کی یہ رائے بھی ملتی ہے۔

''اپنے ماضی کو رد کئے بغیر مستقبل کی خوشحالی سے دستبردار ہوئے بغیر وہ اپنے تاریخی دور کی حرکت و حرارت کی نمائندگی کرنے میں دیر تک کہیں نہیں تھمتا۔ کیا عجب یہی سبب ہو کہ آج مختلف بلکہ متضاد سیاسی سماجی نظاموں اور متصادم تہذیبی قدروں کے ماحول میں اس کے کلام کو پہلے سے بھی زیادہ سراہا جا رہا ہے۔''

تیسرے مضمون ''بمبئی میں چند روز'' میں اقبال کے سماجی شعور اور بمبئی کے کاسموپالٹین ماحول کے پس منظر میں اقبال کی شخصیت کے بعض لطیف گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔

''اقبال کی تلاش'' کا چوتھا مضمون اقبال اور جرمنی کے عنوان سے ملتا ہے۔ اس مضمون کو اقبالیات میں اس اعتبار سے بڑی اہمیت کا مقام حاصل ہے کہ ظ صاحب نے اقبال کی داخلی اور خارجی زندگی کو مضطرب یا ہم آہنگ کرنے والے اور محرکات تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس کی فکر اقبال میں بڑی اہمیت ہے۔ عطیہ بیگم کے خطوط سے استدلال کرتے ہوئے جرمنی کے علمی ماحول میں اقبال کو چلتا پھرتا کبھی مسرور کبھی مغموم دکھایا گیا ہے۔ نطشے' گوئٹے اور مارکس پر اقبال کے ایک ایک مصرعے کے ذریعہ ان کی رائے کو پیش کیا ہے۔

نطشے کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

قلب او مومن، دماغش کافر است

گوئٹے کے بارے میں :

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

مارکس کے بارے میں:

آں کلیم بے تجلی ،آں مسیحِ بے صلیب

یہ تین مصرعے نقل کر کے ظ صاحب نے جو تبصرہ کیا ہے وہ ان کے نقطہ نظر کا غماز ہے۔ لکھتے ہیں: ایک کے جوش جنوں میں زندگی کی تڑپ نقطہ عروج پر ہے اور باقی دونوں وہ ہیں کہ پیغمبروں کی مسند دبائے بیٹھے ہیں۔ ظ انصاری کا خیال یہ بھی ہے کہ جس طرح جینا ''JENA'' میں جرمنی کی شکست کے بعد جرمن قوم کا نشو ونما ہوا' کہا جا سکتا ہے کہ ۱۷۹۰ء میں اسلام کی پولٹیکل شکست کے بعد اسلام اور اس کے مسائل پیدا ہوئے۔ ہندوستان' ترکی اور جرمنی کا یہ مثلث نئے ارادے اور نئی زندگی کے پس منظر پر اقبال کے ذہن کا مرکزی نقطہ تھا۔

پنجاب کے پس منظر پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کی سیاسی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اقبال کی سیاسی زندگی سے بیزاری اور اس وقت کے سیاست دانوں کا طرزِ عمل اس مختصر سے مضمون میں نمایاں ہو کر سامنے آ گیا ہے۔

''شان جمالی اور شان جلالی'' والے مضمون میں ظ صاحب نے اقبال کے تصورِ تاریخ اور ان کے نظریۂ قوت وشوکت سے بحث کی ہے۔ ان کی نظم گورستان شاہی اور مسجد قرطبہ میں ظاہر کئے گئے خیالات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں ظ صاحب کی یہ رائے ملتی ہے:

> ''تاریخ کے فیصلہ کن عوامل میں طبقاتی کشمکش کا عمل ان پر نہ کھلا۔ ہندوستانی تاریخ کے اس عجوبہ کی گہرائی میں وہ نہ اُتر سکے کہ نہ یہاں فاتح بار بار یا تو مفتوح ہوتے رہے یا ناپید' وہ جنہوں نے جلالی شان سے اس اونگھتی سرزمین کو فتح کیا' روندتے چلے گئے وہ یہاں کی جمالی صفات کے سامنے نہتے ہو کر رہ گئے''۔ ظ صاحب کی یہ رائے اس لئے نظرِ ثانی کی محتاج نظر آتی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے اثرات ہو سکتا ہے ہندوستانی سماج سے مٹتے جا رہے ہوں لیکن اسلامی فکر جس کے نمائندوں میں خود اقبال بھی ہیں اپنی پوری طاقت کے ساتھ

آج بھی اپنے پیام میں کشش رکھتی ہے ۔

اس کتاب میں ''فراق ووصال'' کے عنوان سے ایک بہت ہی دلچسپ ''گستن'' اور ''پیوستن'' کے نظریے کو وسیع تر سماجی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ موضوع اس قدر گمبھیر ہے کہ اس پر کسی علٰحدہ مضمون میں ہی بحث کی جا سکتی ہے تاہم ظ صاحب کی تلاش منزل کا اک نازک مرحلہ سامنے آتا ہے۔ اقبال اور رومی کی رفاقت کی چھان بین میں ظ صاحب نے اقبال اور رومی کے مشترک کے عناصر کو ایک ایک کر کے گنا لیا ہے۔ مختلف منازل کی نشاندہی کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''مولانا جلال الدین پیر رومی ہیں اور اقبال مرید ہندی، اِدھر سے مسائل پر سوال ہے اُدھر سے جواب۔ معلوم ہوتا ہے۔ اقبال رومی کی اُنگلی تھامے چل رہے ہیں۔ اس ہمنوائی کا راز علمائے اقبال نے اپنے طور پر دریافت کیا ہے۔''

ظ صاحب نے بشیر احمد ڈار، سید عبداللہ، پروفیسر محمد شریف اور خلیفہ عبدالحکیم کی تحریروں سے اقتباسات پیش کر کے اس مسئلے میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے اس کو نمایاں کیا ہے اور اپنی دانست میں ایک انکشاف کے طور پر چاروں مذکورہ علمائے اقبال کی رائے کو رد کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔ اصل وجہ خود اقبال نے مثنوی گلشن راز جدید کی تمہید میں صاف صاف بتا دی ہے کہ رومی کو چنگیزی قیامت سے واسطہ پڑا تھا اور میری نگاہ نے دوسرا انقلاب دیکھا ہے۔

نگاہم انقلابے دیگرے دید
طلوعے آفتابے دیگرے دید

ظ صاحب کے اس بیان پر اقبال کے طالب علم اور خود ظ صاحب کا وہ ہمسفر جو تلاش اقبال میں ان کے ساتھ ہے، انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ گلشن راز کی تمہید سے رومی کا دور کا بھی تعلق نہیں چوں کہ ظ صاحب کی فارسی دانی کے باب میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے اسے سہو ونسیاں پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ظ صاحب کو دانائے تبریز کی وجہ سے غالباً تسامح ہوا ہے۔ قدرے تفصیل سے اس واقعہ کو سنئے۔ گلشن راز جدید کی تمہید میں اقبال لکھتے ہیں:

بطرزِ دیگر از مقصود گفتم جواب نامۂ محمود گفتم
زعہدِ شیخ تا ایں روزگارے نزد مردے بجانِ ما شرارے

کفن در بر بخا کے آرمیدیم ولے یک فتنۂ محشر ندیدیم
گذشت از پیشِ آں دانائے تبریز قیامت ہا کہ است از کشتِ چنگیز
نگاہم انقلابے دیگرے دید طلوع آفتابے دیگرے دید

ظ صاحب کو پتہ نہیں کیوں یہ مغالطہ ہوا کہ یہاں دانائے تبریز سے مراد جلال الدین رومی ہیں۔ کوئی استعارہ نہیں جس کی تاویل کی جاسکے۔ صاف اور واضح الفاظ میں اقبال صاحبِ گلشن راز محمود شبستری کا ذکر کر رہے ہیں۔

''جواب نامۂ محمود گفتم'' کے بعد سلسلہ سخن شیخ محمود شبستری کے بارے میں آگے بڑھتا ہے۔ اقبال اپنے اور محمود شبستری کے عصر کا تقابل کرتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کر رہے ہیں۔ یہاں جلال الدین رومی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

'' قلندر کا لہو'' ترنگ کے عنوان سے جو انشائیہ اس کتاب کی زینت ہے اس کی قدر و قیمت ہمارے پاس ایک تخلیقی انشائیے کی ہے جس میں ظ انصاری دل کا چراغ جلاتے ہیں۔ تخیل کی شادابی حقیقت کی تصویر کے قریب ہے۔ ایک ایسا رجزیہ نغمہ جو کوہسار کا نظارہ کرنے والی آنکھ اپنی زبان منظر رقم سے بلندیوں کو سُروں میں ڈھال رہی ہے۔ اس مضمون میں ظ انصاری ایک صاحبِ دل فقیر کی ان خلوتوں میں باریاب ہیں جہاں قلندری مقام ''گلستن و پیوستن'' سے پرے انسانی فطرت کے جلالی اور جمالی صفات کو متشکل کر رہی ہے۔ اقبال کی آخری زندگی کا پس منظر تھکن نہیں' ولولہ ہے' حوصلہ ہے' خیر ہے' صداقت ہے۔ حسن و جلال کا پیکر ہے جو انسانوں کا رفیق ہے' محبت کا نقیب ہے۔ ظ انصاری کا قلم اوجِ کمال پر ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہمارا شاعر کہ! ''گدائے گوشہ نشین است و دل غنی دارد''

ہمیں جب اپنے باطن کی صحبت میں بلاتا ہے' فرضی ناموں کے روپ دھار کر سر، علامہ حکیم الامت، ڈاکٹر، ترجمان حقیقت، شاعر مشرق، کے سارے خطابوں کے چولے اُتار کر' جب ہم سے ملتا ہے تو پھر وہ کچھ اور ہی ہے' وہ زندہ رود ہے بہتا دریا، چاندنی میں جوش مارتا ٹھٹھار، دوپہر میں آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا' وہ بڈھا بلوچ ہے۔ وہ وادیٔ کشمیر کا ضیغم لولابی ہے' وہ محراب گل افغان ہے' حمیت و غیرت کا مارا جسے زندگی اور موت کے دوراہے پر دوٹوک فیصلہ کرنا ہے۔ خلعتِ انگریزیا پیرہنِ چاک چاک''۔

اقبال کی تمنا تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے ترسٹھ برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوں۔ ساٹھ کے پیٹے میں تھے جب انہوں نے بڈھے بلوچ ضیغم لولابی اور محراب گل کی آنکھوں سے اس طوطا چشم دنیا کو دیکھا۔ اور ہمیں اپنے بطون میں کروٹیں لیتے ہوئے زندہ رود کا جلوہ دکھایا۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مردِ کہستانی

مطالعہ اقبال ہی میں نہیں بلکہ اُردو ادب کی تاریخ میں اس انشائیہ کو اُونچا مقام ملے گا۔ اقبال کی تلاش میں ظ صاحب اونچے نیچے راستوں سے فکر کے خارزار میں پہنچے، دامن کو سمیٹا اور ایک جست لگائی تو من کی دنیا میں ڈوب کر.....

○○○○○

# ظ۔انصاری کی کتاب ''اقبال کی تلاش'' سے ایک اقتباس

''خاص کمیونسٹ حلقوں میں اقبالؔ پر کتنی ہی نکتہ چینی ہوتی رہی، مگر ترقی پسند شاعری اور شاعروں کو اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اقبالؔ سے فیض اٹھائیں۔ اُن کے مردانہ اور پرسوز ترنم سے، سیاسی مسائل کے بیباکانہ بیان میں رجز کی شان سے، رزمیہ فضا کے آکسیجن سے اپنا چراغ جلائیں اور ٹھیک اسی طرح ادھوری تاویلیں کر کے اپنی طرف کھینچیں جیسے خود اقبالؔ نے ''بالشویزم'' کو اپنی طرف کھینچا تھا۔

اقبالؔ کے قبول عام میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ ترقی پسند شاعری کا اچھا برا۔ قابلِ ذکر حصہ، اس ''زندہ رود'' سے اپنی پیاس بجھاتا رہا ہے۔

البتہ ۵۶۔۱۹۵۵ء کے بعد اردو اور قریبی زبانوں کے ادب میں جدیدیت (Modernism) کی لہر نے اس تسلسل کو توڑا۔ یا کم از کم اس سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ کلاسیکی سرمائے سے لو لگانے والے چند سخنوروں کے سوا، اگر چہ جدیدی حلقوں میں اقبالؔ کے انتخابِ الفاظ اور حسن و شکوہ کو مثال نہیں بنایا جاتا، مثال بنا در کنار، ان کے تبلیغی کلام کو غیر شاعرانہ گردانا جاتا ہے تاہم کس کے منہ میں زبان ہے جو کہے کہ اقبالؔ نے لفظ و معنی کی ان سڑکوں پر کنکر پتھر نہیں کوٹا جن پر اردو کی جدید اور آئندہ کی شاعری ہچکولے کھاتی چل رہی ہے!

آدمی کی سرکشی، اس کی تخلیقی صلاحیت کا حاضر و موجود سے پنجہ کشی کرنا، خدائی کارخانے میں ''کارِ نادر'' کر گزرنا، اور فطرت کی تسخیر میں انوکھی جرات دکھاتے ہوئے اپنی راہ الگ کر لینا، وہ موضوعات ہیں جن کے لئے اقبالؔ نے صرف استعارے اور تمثیلات ہی نہیں تراشے، بلکہ یہ ورثہ ترقی پسندوں کو اور ان کے بعد جدیدیوں کو سونپ دیا۔ منہ بنا کر ہی سہی، تاہم اردو کی جدید شاعری اسے قبولنے پر آمادہ ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے کھردرے مسائل کو نئے ڈھب کی نیم شاعرانہ زبان دینے میں یا اس زبان کے ساتھ نیا برتاؤ اختیار کرنے میں اقبالؔ کا قدم حالیؔ اور ان کے ہمعصروں سے کافی آگے پہنچا۔ اُن کے تلوے اس راہ کے بہت سے کانٹے چنتے ہوئے گئے ہیں۔''

''منتے برقدمِ راہرونست مرا''

سید امتیاز الدین

# بچوں کیلئے اقبال کی نظمیں.....ایک مطالعہ

بچے ہر قوم اور سماج کی دولت ہوتے ہیں۔قوم کا مستقبل اُن سے وابستہ ہوتا ہے۔اس لیے ہر ملک بچوں کی تعلیم و تربیت اور اُن کی صحت کی فکر کرتا ہے۔ ہمارے قومی بجٹ میں تعلیم پر اُتنی رقم مختص نہیں کی جاتی جتنی دوسرے ترقی یافتہ ممالک اپنے بجٹ میں مختص کرتے ہیں۔ کئی یورپی ممالک ایسے بھی ہیں جہاں پرائمری اسکول کے اساتذہ کی تنخواہیں اتنی معقول ہوتی ہیں کہ اُن کی تنخواہوں اور یونیورسٹی کے پروفیسروں کی تنخواہوں میں بہت بڑا فرق نہیں ہوتا۔ یہی حال بچوں کے ادب کا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بچوں کے لیے سلیس پیرائے میں کتابیں اور رسائل ملتے ہیں۔ دلچسپ پیرائے میں معلوماتی کتا بچوں کے لئے کامکس کی اصطلاح بھی یورپ ہی سے نکلی ہے۔ ہندوستان میں زمانہ قدیم ہی سے بچوں کے لیے قصے اور کہانیاں موجود تھیں جیسے پنچ تنتر کی کہانیاں۔ان میں پریوں کی اور جانوروں کی کہانیاں بھی شامل ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ نصیحت آموز قصے بھی ملتے ہیں۔پنچ تنتر کی کہانیاں ساری دنیا میں مشہور ہوئیں اور آج بھی وہ دل چسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اردو ادب میں بھی بچوں کے لئے کہانیاں لکھی گئیں۔ کہتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد نے خود اپنے بچوں کے لئے کتابیں لکھی تھیں۔ اتفاق کی بات کہ ایک مرتبہ اس وقت کا انگریزی ناظم تعلیمات اُن کے گھر آیا اور وہ اُن کتابوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے اُن کتابوں کو ڈپٹی نذیر احمد کی اجازت سے سرکاری نصابِ تعلیم میں شامل کر دیا۔

بچوں کے عالمی ادب کا تذکرہ ڈینیل ڈیفو کی مشہور کتاب رابنس کروسو کے ذکر کے بغیر ادھورا رہ جاتا ہے۔ رابنس کروسو کے سفرناموں میں بچوں کے لئے انوکھی دل چسپی کا سامان موجود ہے۔اسی طرح جوناتھن سوفٹ کی کتاب گلیور کے سفرنامے للّی پٹ کے کردار سے عالمی شہرت پا چکی ہے۔ایلس اِن ونڈر لینڈ' ڈیوڈ کاپر فیلڈ اور ٹام سایر دنیا کے سبھی بچوں کی تفریح طبع کا باعث رہی ہیں۔الف لیلیٰ کی کہانیاں جیسے سند باد جہازی کا سفرنامہ' علاالدین کا چراغ اور علی بابا چالیس چور ہر دور میں دل چسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں اور یہ داستانیں ایسی ہیں کہ زمانے کی گرد بھی اُن کی آب و تاب کو کم نہیں کر سکی۔

اردو میں مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے جو درسی کتابیں ترتیب دیں اُن میں سبق آموز باتیں دل چسپ انداز اور سادہ زبان میں پیش کی گئیں۔ اُنہوں نے اخلاق کی تربیت' فطرت کی تصویر کشی' حفظانِ صحت کے اُصول' آداب مجلس عام معلومات جیسے موضوعات کو اِس انداز میں پیش کیا جس سے ننھے ذہنوں میں قبولیت کی صلاحیت پیدا ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جب جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر بنے تو اُن کے دور میں بچوں کا رسالہ ''پیام تعلیم'' جاری ہوا جو بچوں کے صحت مندانہ ادب کا ترجمان ثابت ہوا۔ خود ذاکر صاحب نے بچوں کے لئے بڑی عمدہ کتابیں لکھیں''۔ ابو میاں کی بکری'' ذاکر صاحب کی لکھی ہوئی ایک کہانی ہے جس میں بڑے لطیف انداز میں جذبہ آزادی کو اُبھارا گیا ہے۔ قومی یک جہتی کے فروغ اور تعصب کی لعنت سے اپنے آپ کو دور رکھنے کی ایک کوشش اُن کی کہانی ''آؤ گھر گھر کھیلیں'' ہے۔

اُردو کی ابتدائی درسی کتب میں مولانا محمد حسین آزاد کی مرتب کردہ کتابوں کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ بابائے اُردو عبدالحق نے بھی درسی کتابیں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع کیں۔ حالی' شبلی' اسماعیل میرٹھی سرور جہاں آبادی' حامد اللہ افسر' حفیظ جالندھری چکبست' تلوک چند محروم' شفیع الدین نیر وغیرہ نے بچوں کے لئے نظمیں کہانیاں وغیرہ لکھیں۔

امیر خسرو کی پہیلیاں بھی بڑوں کے ساتھ بچوں کی دل چسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

میر تقی میر یوں تو شہنشاہ غزل کہلاتے ہیں اور اُن کے کلام میں یاس و حرماں کی کیفیت زیادہ ہے لیکن اُن کی ایک نظم ''موہنی بلی'' ملاحظہ ہو۔

ایک بلی موہنی تھا اُس کا نام
اُس نے میرے گھر کیا آکر قیام
ایک دو سے ہوگئی اُلفت بہت
کم بہت جانے لگی اُٹھ کر نپٹ
ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ
دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ
چیچھڑا ٹکڑا یا جو پایا کرے
فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے

نظیر اکبر آبادی کا طرزِ سخن بچوں کا دل بھی لبھاتا ہے۔ اُن کی نظمیں ریچھ کا بچہ' بکری کا بچہ'

بلیوں کی لڑائی' تربوز' تِل کے لڈو' ہولی' دیوالی، کیا دن تھے وہ بھی یارو جب ہم تھے بھولے بھالے'' آدمی نامہ بچوں کے لئے بھی کشش رکھتے ہیں۔

مولانا حالؔی نے بھی بچوں کے لیے نظمیں کہی ہیں۔ اُن کی ایک نظم ''بڑھیا کا دیا'' بڑی خوبصورت نظم ہے جس کے دو تین اشعار دیکھیے:

جھٹپٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں راہ سے آسان گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
راہ میں کیا خوش نما وہ نور کے مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اسمٰعیل میرٹھی کی ایک نظم جو بالکل چھوٹے بچوں کی سمجھ میں بھی آسانی سے آجا سکتی ہے ''گائے'' ہے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی
اُس مالک کو کیوں نہ پکاریں جس نے بہائیں دودھ کی نہریں
خاک کو اُس نے سبزہ بنایا سبزے کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس ہری تھی بن میں دودھ بنی وہ گائے کے تھن میں
کیا ہی غریب اور کیسی پیاری صبح ہوئی جنگل کو سدھاری
پانی پی کر چارہ چر کر
شام کو آئی اپنے گھر پر

اقبال عظیم شاعر تو تھے ہی لیکن وہ اُن معنوں میں عظیم شاعر نہیں تھے جیسے میرؔ و غالبؔ تھے۔ اُن کی واردات قلبی بھی مختلف تھی۔ اُن کی زندگی اُن تمام مرحلوں سے گزری تھی جن سے ایک عام آدمی کی زندگی گزرتی ہے۔ لیکن جن محسوسات کو اُنہوں نے شعر کے قالب میں ڈھالا وہ ذاتی مشاہدے کے ساتھ ساتھ کسی الہامی کیفیت کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری ایک دانائے راز کی حکایت لگتی ہے۔ اُن کی شاعری اس طرح پروان چڑھی ہے جیسے ایک نسل پروان چڑھتی ہے۔ اقبال نے ۱۹۰۵ء کے آس پاس بچوں کے لیے نظمیں کہی ہیں جو اُن کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جن بچّوں نے اُن کی نظمیں اُسی دور میں پڑھی ہوں گی وہ ۱۹۳۸ء تک یعنی شاعر کی وفات تک نہ صرف جوانی کی حدوں کو پار چکے تھے بلکہ بالغ نظری اور شعور کی پختگی کی

اُن منزلوں میں تھے کہ کلامِ اقبال اُن کو محرم رازِ درونِ مئے خانہ بننے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس طرح اقبال کی شاعری نے بچپن سے لے کر سنِ شعور تک ایک پوری نسل کی رہنمائی کی ہے۔ جس طرح انسانی زندگی کا یہ کارواں چلتا رہتا ہے۔ ایک نسل دوسری نسل سے زماں ومکاں کا جائزہ لیتی ہے اور دنیا کی تعمیر و تشکیل میں اپنا حصہ ادا کرتی ہے۔ اُسی طرح اقبال اپنی شاعری کے ہزار شیوہ حُسن کے ساتھ ہر دور اور ہر نسل کے ہم عصر، رفیق اور رہنما بن جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ، ذوق وشوق، شکوہ اور جواب شکوہ کے شاعر نے اپنے کلام میں مکڑا اور مکھی، گائے اور بکری وغیرہ کو بھی ایک مستقل جگہ دی ہے تاکہ جو بچہ آج ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' پڑھے وہی بچہ کل ''مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ'' کہنے کا اہل ہو سکے۔

اقبال نے رسالہ ' مخزن لاہور کے جنوری ۱۹۰۲ء کے شمارے میں ''بچوں کی تعلیم وتربیت'' کے زیرِ عنوان اپنے مضمون میں لکھا تھا:

> ''تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریقِ تعلیم علمی اصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصے میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں اور دنیوی زندگی ایک ایسا دل فریب نظارہ معلوم ہو کہ اُس کے ظاہری حُسن کو مطعون کرنے والے فلسفی بھی اُس کی خوبیوں کے ثناخوان بن جائیں''۔

قبال نے بچوں کے لیے چند نصابی کتب بھی مرتب کی تھیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

| | تاریخ اشاعت |
|---|---|
| ۱۔ اردو کورس ........ چھٹی جماعت کے لیے | ۱۹۲۴ تا ۱۹۳۰ء |
| ۲۔ اردو کورس ........ ساتویں جماعت کے لیے | |
| ۳۔ اردو کورس ........ آٹھویں جماعت کے لیے | |
| ۴۔ تاریخ ہند بہ اشتراک لالہ رام پرشاد | ۱۹۱۳ء |
| ۵۔ آئینۂ عجم (فارسی نظم) برائے میٹریکولیشن | ۱۹۲۷ء |
| ۶۔ انتخابِ نکاتِ بیدل (فارسی) برائے بی اے | ۱۹۲۲ء |

علامہ اقبال کو بچوں سے دلی لگاؤ تھا۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں جن کی موٹر پر ایک نظم بانگِ درا میں شامل ہے، اقبال کے قریبی دوستوں میں تھے۔ ذوالفقار علی خاں کا آٹھ سالہ لڑکا خورشید علی خاں اپنے گھر کے باغ میں کھیلتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اقبال نے دیکھا کہ بچہ درخت سے

گوند نکال رہا ہے۔ اقبال نے پوچھا چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو۔ لڑکا بولا ''جی گوند نکال رہا ہوں''۔ اقبال نے اُسی وقت مصرع موزوں کر دیا۔

''چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے''

بچے نے اصرار کیا کہ اس مصرعے کو مکمل کر کے شعر کہہ دیجیے۔ تو اقبال نے اُس کی خواہش کی اس طرح تکمیل کر دی۔

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہوگی اُن کی شادی کسی نیک بخت سے

اقبال نے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں اُن میں اخلاقی پہلو نہایت لطیف اور دل نشیں انداز میں ظاہر ہوتا ہے:

بانگِ درا میں بچوں کے لیے نو نظمیں شامل ہیں۔

ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ہمدردی، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

ایک مکڑا اور مکھی'' کا مرکزی خیال یہ ہے کہ خوشامدانہ گفتگو کو سچ نہیں سمجھنا چاہیے اور کسی کی چکنی چپڑی باتوں کے جال میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ ایک پہاڑ اور گلہری اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اللہ نے کوئی چیز بے مقصد نہیں بنائی۔ کسی چھوٹی سی ذی روح کو بھی حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو ذلیل اور بے حقیقت سمجھنا بہت بڑی بھول ہے۔

ایک گائے اور بکری میں آدمی کی خوبیاں اور پالتو جانوروں پر اُس کے احسان کا ذکر ہے۔ ''بچے کی دعا''، تعمیرِ سیرت اور کردار سازی کا ایک بہترین نسخہ ہے۔ یہ نظم اس قابل ہے کہ مدارس میں روزانہ پڑھائی جائے تاکہ بچوں میں نیک بننے اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ پیدا ہو۔ ہمدردی میں جگنو جیسے چھوٹے سے پتنگے کے جذبۂ ہمدردی کو ظاہر کیا گیا ہے کہ کس طرح بلبل کو اُس کے آشیاں تک راہ سجھانے کے لیے جگنو اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ ماں کا خواب دکھوں پر صبر کی تلقین ہے۔ پرندے کی فریاد میں شاعر بتلاتا ہے کہ اسیری ایک ایسی لعنت ہے جو پرندے کو بھی پسند نہیں۔ جب یہ نظم کہی گئی اُس وقت ملک غلام تھا۔ اس طرح بچوں میں اس نظم کے ذریعے سے اقبال نے آزادی کی تڑپ اور غلامی سے نجات کی خواہش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ''ترانۂ

ہندی'' اپنی خوبصورت طرزِ ادا' بلند پایہ خیالات اور حب الوطنی کے جذبے کے سبب ملک کے طول وعرض میں غیر معمولی طور پر مشہور ومقبول ہوا۔ آج بھی اُس کی اہمیت مسلم ہے اور وہ قومی ترانہ نہ سہی قومی گیتوں میں سرِفہرست ہے۔

بانگِ درا کی نظموں کے علاوہ اقبال نے بچوں کے لیے اور بھی نظمیں کہی ہیں۔ اِن نظموں کو جگن ناتھ آزاد نے فقیر سید وحیدالدین صاحب سے جو اقبالؔ کے خاص دوستوں میں تھے حاصل کیا اور ''بچوں کا اقبال'' کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ اُن نظموں کے نام ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ شہد کی مکھی۔ ۲۔ ننھی سی ایک بوند۔ ۳۔ محنت۔ ۴۔ گھوڑوں کی مجلس۔ ۵۔ چاند اور شاعر۔ ۶۔ چند نصیحتیں

شہد کی مکھی نہایت آسان پیرائے میں بڑی خوبصورت نظم ہے۔ شاعر نے ابتداء میں تمہید باندھی ہے اور بچوں سے سوال کیے ہیں۔ پھر خود ہی اُن سوالوں کا جواب دیا ہے۔ پہلے تو شہد کی مکھی اور اُس کے کام کو سراہا گیا ہے۔ پھر شہد کی تعریف کی گئی۔ بہت سے مصرعوں پر سورہ نحل کی آیات شریفہ کا پرتو محسوس ہوتا ہے۔ پھر بچے کو نصیحت ہے کہ جس طرح شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوستی ہے اور شہد فراہم کرتی ہے اسی طرح بچہ کتابوں کا رس چوسے، علم حاصل کرے اور دنیا کو فیض پہنچائے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

## شہد کی مکھی

اس پھول پہ بیٹھی، کبھی اس پھول پہ بیٹھی
بتلاؤ تو ' کیا ڈھونڈتی ہے شہد کی مکھی ؟
کیوں آتی ہے، کیا کام ہے گلزار میں اس کا ؟
یہ بات جو سمجھاؤ تو سمجھیں تمھیں دانا
چہکارتے پھرتے ہیں جو گلشن میں پرندے
کیا شہد کی مکھی کی ملاقات ہے ان سے؟
عاشق ہے یہ قمری کی ' کہ بلبل پہ ہے شیدا ؟
یا کھینچ کے لاتا ہے اسے سیر کا چسکا ؟

دل باغ کی کلیوں میں تو اٹکا نہیں اس کا ؟
بھاتا ہے اسے ان کے چٹکنے کا تماشا

سبزے سے ہے کچھ کام کہ مطلب ہے صبا سے ؟
یا پیار ہے گلشن کے پرندوں کی صدا سے ؟

بھاتا ہے اسے پھول پہ بلبل کا چہکنا؟
یا سرو پہ بیٹھے ہوئے قمری کا یہ گانا ؟

پیغام کوئی لاتی ہے بلبل کی زبانی ؟
یا کہتی ہے یہ پھول کے کانوں میں کہانی ؟

کیوں باغ میں آتی ہے، یہ بتلاؤ تو جانیں
کیا کہنے کو آتی ہے، یہ سمجھاؤ تو جانیں

بے وجہ تو آخر کوئی آنا نہیں اس کا
ہشیار ہے مکھی، اسے غافل نہ سمجھنا

بے سود نہیں، باغ میں اس شوق سے اڑنا
کچھ کھیل میں یہ وقت گنواتی نہیں اپنا

کرتی نہیں کچھ کام اگر عقل تمہاری
ہم تم کو بتاتے ہیں، سنو بات ہماری

کہتے ہیں جسے شہد، وہ اک طرح کا رس ہے
آوارہ اسی چیز کی خاطر یہ مگس ہے

رکھا ہے خدا نے اسے پھولوں میں چھپاکر
مکھی اسے لے جاتی ہے، چھتے میں، اُڑاکر

ہر پھول سے یہ چوستی پھرتی ہے اسی کو
یہ کام بڑا ہے، اسے بے سود نہ جانو

مکھی یہ نہیں ہے، کوئی نعمت ہے خدا کی
ملتا نہ ہمیں شہد، یہ مکھی جو نہ ہوتی

اس شہد کو پھولوں سے اڑاتی ہے یہ مکھی
خود کھاتی ہے، اوروں کو کھلاتی ہے یہ مکھی

قرآن کی آیات:

انسان کی، یہ چیز غذا بھی ہے، دوا بھی
قوت ہے اگر اس میں، تو ہے اس میں شفا بھی

نتیجہ سبق:

رکھتے ہو اگر ہوش تو اس بات کو سمجھو
تم شہد کی مکھی کی طرح علم کو ڈھونڈو
یہ علم بھی اک شہد ہے اور شہد بھی ایسا
دنیا میں نہیں شہد کوئی اس سے مصفا
ہر شہد سے، جو شہد ہے میٹھا، وہ یہی ہے
کرتا ہے جو انسان کو دانا، وہ یہی ہے
یہ عقل کے آئینے کو دیتا ہے صفائی
یہ شہد ہے انساں کی، وہ مکھی کی کمائی

علم صفتِ الٰہی:

سچ سمجھو تو انسان کی عظمت ہے اسی سے
اس خاک کے پتلے کو سنوارا ہے اسی نے

شہد کا نکلنا:

پھولوں کی طرح اپنی کتابوں کو سمجھنا
چسکا ہو اگر تم کو بھی کچھ علم کے رس کا

.....

''ننھی سی ایک بوند'' اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب ہم کسی اچھے کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں تو ہمیں اپنی بے وقعتی کا خیال کر کے کم ہمت نہ ہونا چاہیے۔ اگر ہم کام میں نیک نیت ہوں تو دوسرے لوگ بھی ہمارا ساتھ دیں گے اور تائید غیبی ہمیں حاصل ہوگی۔ گو یہ نظم بچوں کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر کہی گئی ہے لیکن اس میں انشا کا رنگ بھی کہیں کہیں جھلکتا ہے۔

اس سادہ و پُر کار نظم میں بڑی دل کشی ہے۔ یہ نظم اس قابل ہے کہ پوری کی پوری نقل کر دی جائے۔ یہ نظم ''جہاں تک ہو سکے نیکی کرو'' کے عنوان سے کہی گئی نظم درج ذیل ہے۔

.....

# ''جہاں تک ہو سکے، نیکی کرو''

کہتے ہیں ایک سال نہ بارش ہوئی کہیں
گرمی سے آفتاب کی تپنے لگی زمیں
تھا آسمان پر نہ کہیں ابر کا نشاں
پانی ملا نہ جب تو ہوئیں خشک کھیتیاں
لالے پڑے تھے جان کے ہر جان دار کو
اُجڑے چمن، ترستے ترستے بہار کو
منھ تک رہی تھی خشک زمیں آسمان کا
اُمید ساتھ چھوڑ چکی تھی کسان کا
بارش کی کچھ اُمید نہ تھی اس غریب کو
یہ حال تھا کہ جیسے کوئی سوگوار ہو
اک دن جو اپنے کھیت میں آکر کھڑا ہوا
پودوں کا حال دیکھ کے بے تاب ہوگیا
ہر بار آسماں کی طرف دیکھتا تھا وہ
بارش کے انتظار میں گھبرا رہا تھا وہ
ناگاہ ایک ابر کا ٹکڑا نظر پڑا
لاتی تھی اپنے ساتھ اڑا کر جسے ہوا
پانی کی ایک بوند نے تاکا اِدھر اُدھر
بولی وہ، اس کسان کی حالت کو دیکھ کر
'' ویران ہوگئی ہے جو کھیتی غریب کی
ہے آسمان پر نظر اس بدنصیب کی
دل میں یہ آرزو ہے کہ اس کا بھلا کروں
یعنی برس کے کھیت کو اس کے ہرا کروں ''

بوندوں نے جب سنی، یہ سہیلی کی گفتگو
ہنس کر دیا جواب کہ "اللہ رے آرزو!

تو اک ذرا سی بوند ہے اتنا بڑا یہ کھیت
تیرے ذرا سے نم سے نہ ہوگا ہرا یہ کھیت
تیری بساط کیا ہے کہ اس کو ہرا کرے
ہوخود جو ہیچ، کیا وہ کسی کا بھلا کرے"

اس بوند نے مگر یہ بگڑ کر دیا جواب
کہہ دی وہ بات، جس نے کیا سب کو لاجواب

"مانا کہ ایک بوند ہوں، دریا نہیں ہوں میں
قطرہ ذرا سا ہوں کوئی چھینٹا نہیں ہوں میں

مانا کہ میرا نم کوئی دریا کا نم نہیں
ہمت تو میری بحر کی ہمت سے کم نہیں
نیکی کی راہ میں کبھی ہمت نہ ہاریے
مقدور ہوتو عمر اسی میں گزاریے

قربان اپنی جان کروں گی کسان پر
کیا لوں گی میں ٹھہر کے یہاں آسمان پر
نیکی کے کام سے کبھی رکنا نہ چاہیئے
اس میں کسی کے ساتھ کی پروانہ چاہیئے

لو، میں چلی" یہ کہہ کے روانہ ہوئی وہ بوند
بوندوں کی انجمن میں یگانہ ہوئی وہ بوند

ٹپ دے سے اُس کی ناک پہ وہ بوند گر پڑی
سوکھی ہوئی، کسان کے دل کی کلی کھلی

دیکھا سہیلیوں نے تو حیران ہوگئیں
ہمت کے اس کمال پہ کی سب نے آفریں

بولیں کہ چاہیئے نہ سہیلی کو چھوڑنا
اچھا نہیں ہے منھ کو رفاقت سے موڑنا
ساتھی کے ساتھ سب کو برسنا ضرور ہے
گر ہم نہ ساتھ دیں تو مروت سے دور ہے
یہ کہہ کے ایک ساتھ وہ بوندیں رواں ہوئیں
چھینٹا سا بن کے کھیت کے اُوپر برس گئیں
قسمت کھلی کسان کی، بگڑی ہوئی بنی
سوکھی ہوئی غریب کی کھیتی ہری ہوئی
پھر سامنے نظر کے بندھا آس کا سماں
تھی آس، آس پاس گیا یاس کا سماں
اُجڑ ہوا جو کھیت تھا، آخر ہرا ہوا
سارا یہ ایک بوند کی ہمت کا کام تھا
دیکھی گئی نہ اس سے مصیبت کسان کی
بے تاب ہو کے کھیت پہ اس کے برس گئی
ننھی سی بوند اور یہ ہمت، خدا کی شان!
یہ فیض، یہ کرم، یہ مروّت خدا کی شان!

چاند اور شاعر اقبال کی مخصوص انداز میں کہی گئی اس میں شاعر چاند کی روشنی کی تعریف کرتا ہے اور اُس سے کہتا ہے کہ میں بھی تیری طرح روشن بن کر زمانے میں نام کمانا چاہتا ہوں۔ چاند شاعر کو جواب دیتا ہے کہ میرا نور ذاتی نہیں ہے بلکہ سورج سے مستعار ہے۔ اگر تمہیں بھی روشنی پھیلانا ہو تو اپنے لئے ایک آفتاب ڈھونڈو۔ علم تمہارے لئے آفتاب ہے۔ چاند گھٹتا بڑھتا ہے لیکن آفتاب علم کو زوال کا کھٹکا نہیں۔ اگر تم علم حاصل کرو تو جو کمال تمہیں حاصل ہوگا وہ تمہیں ایسا نور بخشے گا جو دنیا کے لئے بھی فیض رساں ہوگا اور تمہارے لئے بھی۔ یہ نظم اتنی دل آویز ہے کہ اِس کو صرف بچوں کے لیے سمجھنا بڑوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

# چاند اور شاعر

شاعر

اک رات میرے دل میں جو کچھ آگیا خیال
یوں چودھویں کے چاند سے میں نے کیا سوال
اے چاند ! تجھ سے رات کی عزت ہے لاج ہے
سورج کا راج دن کو، ترا شب کو راج ہے
تو نے یہ آسماں کی محفل سجائی ہے
تو نے زمیں کو نور کی چادر اُڑھائی ہے
تو وہ دیا ہے جس سے زمانے میں نور ہے
ہے تو فلک پہ، نور ترا دور دور ہے
پھیکی پڑی ہوئی ہے ستاروں کی روشنی
گویا کہ اس چمن پہ خزاں کی ہوا چلی
تیری چمک کے سامنے شرما گئے ہیں یہ
تیری ہوا بندھی ہے تو مرجھا گئے ہیں یہ
اس وقت تیرے سامنے سورج بھی مات ہے
دولہا ہے تو ، نجوم کی محفل برات ہے
پائی ہے چاندنی یہ کہاں سے ، بتا مجھے
یہ نور، یہ کمال، کہاں سے ملا تجھے
مجھ کو بھی آرزو ہے کہ ایسا کمال ہو
تیری طرح کمال مرا بے مثال ہو
روشن ہو میرے دم سے زمانہ اسی طرح
دنیا میں اپنا نام نکالوں تری طرح
حاصل کروں کمال، بنوں چودھویں کا چاند
تو ہے فلک کا چاند، بنوں میں زمیں کا چاند

ہرایک کی نظر میں سماؤں اسی طرح
شہرت کے آسمان پہ چمکوں اسی طرح

چاند

میرا سوال سن کے کہا چاند نے مجھے
لے بھید اپنے نور کا کہتا ہوں میں تجھے
سورج اگر نہ ہوتو گزارا نہیں مرا
مانگا ہوا ہے نور، یہ اپنا نہیں مرا
سورج کے دم سے مجھ کو یہ حاصل کمال ہے
کامل اسی کے نور سے میرا ہلال ہے
پھرتا ہوں روشنی کی تمنا میں رات دن
رہتا ہوں میں کمال کے سودا میں رات دن
مجھ کو اڑائے پھرتی ہے خواہش کمال کی
کر پیروی جہان میں میری مثال کی
بے فائدہ نہ اپنے دنوں کو خراب کر
میری طرح تلاش کوئی آفتاب کر
کہتے ہیں جس کو علم وہ اک آفتاب ہے
یکتا ہے، بے مثال ہے اور لاجواب ہے
ایسے کمال کی ہے تمنا اگر تجھے
تو نور، جاکے، مانگ اسی آفتاب سے
ہے چاند کے کمال کو خطرہ زوال کا
رہتا ہے ہر گھڑی اسے دھڑکا زوال کا
محفوظ اس خطر سے ہنر کا کمال ہے
گھٹنے کا اس کو ڈر ہے نہ خوف زوال ہے
دنیا میں زندگی کا نہیں اعتبار کچھ
رہتی ہے اس چمن میں ہمیشہ بہار کچھ؟

انسان کو فکر چاہیے ہر دم کمال کی
"کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی"

.....

"محنت" بھی ایک خوبصورت نظم ہے۔ اِس نظم کو پڑھتے ہوئے مولانا حالؔی کی مشہور غزل "بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ" کی یاد آجاتی ہے۔ یہاں نظم "محنت" بھی نقل کی جاتی ہے کیونکہ یہ بھی تبرکات میں سے ہے اور بانگِ درا میں شامل نہیں ہے:

## "محنت"

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ
جو کرتے ہیں دُنیا میں محنت زیادہ
اسی میں ہے عزت خبردار رہنا
بڑا دُکھ ہے دُنیا میں بیکار رہنا
اسی سے ہے آباد نگری جہاں کی
یہ دنیا میں بنیاد ہے ہر مکاں کی
بڑائی بشر کو اسی سے ملی ہے
نکمی جو گزرے وہ کیا زندگی ہے
زمانے میں عزت، حکومت یہی ہے
بڑی سب سے دنیا میں دولت یہی ہے
حقیقت جو محنت کی پہچانتے ہیں
اسے کیمیا سے سوا جانتے ہیں
کوئی بڑھ کے محنت سے سونا نہیں ہے
کہ اس زر کو چوری کا کھٹکا نہیں ہے
ہری کھیتیاں جو نظر آرہی ہیں
ہمیں شان محنت کی دکھلا رہی ہیں
نہیں کرتے دنیا میں نادان محنت
جو سمجھیں تو سونے کی، ہے کان محنت

اسی سے زمانے میں دولت بڑھے گی
جو دولت بڑھے گی تو عزت بڑھے گی
کوئی اس کو سمجھے تو اکسیر ہے یہ
بڑا بن کے رہنے کی تدبیر ہے یہ
یہ کل وہ ہے، چلتے ہیں سب کام جس سے
نکلتا ہے انسان کا نام جس سے
جو محنت نہ ہوتی تجارت نہ ہوتی
کسی قوم کی شان و شوکت نہ ہوتی
سہارا ہمارا تمہارا یہی ہے
اندھیرے گھروں کا اُجالا یہی ہے
بڑے کام کی چیز ہے کام کرنا
جہاں کو اسی کام سے رام کرنا
گڈریوں کو شاہنشہی اس نے دی ہے
کولمبس کو دنیا نئی اس نے دی ہے
کھڑا ہے یہ سنسار محنت کی کل پر
یہ سب کارخانہ اسی کل کے بل پر
بناتی ہے یہ شہر نگری، بنوں کو
بساتی ہے، اُجڑی ہوئی بستیوں کو
جو ہاتھوں سے اپنے کمایا وہ اچھا
جو ہو اپنی محنت کا پیسہ وہ اچھا
مری جان! غافل نہ محنت سے رہنا
اگر چاہتے ہو فراغت سے رہنا

.....

نظم ''گھوڑوں کی مجلس'' کا مرکزی خیال ''ایک گائے اور بکری'' سے ملتا جلتا ہے۔ اس لیے اُسے مضمون کی طوالت کے خوف سے شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔ ''چند نصیحتیں'' بھی ایک سبق

آموز نظم ہے جس کا ہر شعر ایک نصیحت ہے۔ اِس نظم میں بھی مولانا حالؔی کا اثر دکھائی دیتا ہے چوں کہ یہ نظم بھی بانگِ درا میں شامل نہیں ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسے بھی یکے از جواہرِ اقبالؔ کے طور پر مضمون میں شامل کر لیں۔

# بچوں کے لیے چند نصیحتیں

کاٹ لینا ہر کٹھن منزل کا کچھ مشکل نہیں
اک ذرا انسان میں چلنے کی ہمت چاہیئے

مل نہیں سکتی زمانے میں نکموں کو مراد
کامیابی کی جو ہو خواہش، تو محنت چاہیئے

خاک محنت ہو سکے گی، ہو نہ جب ہاتھوں میں زور
تندرستی کے لیے ورزش کی عادت چاہیئے

خوش مزاجی سا زمانے میں کوئی جادو نہیں
ہر کوئی تحسیں کہے، ایسی طبیعت چاہیئے

ہنس کے ملنا، رام کر لیتا ہے ہر انسان کو
سب سے میٹھا بولنے کی تم کو عادت چاہیئے

ایک ہی اللہ کے بندے ہیں سب چھوٹے بڑے
اپنے ہم جنسوں سے دنیا میں محبت چاہیئے

ہے برائی سے برائی کام کل پر چھوڑنا
آج سب کچھ کر کے اُٹھو، گر فراغت چاہیئے

جو بروں کے پاس بیٹھے گا بُرا ہو جائے گا
نیک ہونے کے لیے نیکوں کی صحبت چاہیئے

ساتھ والے، دیکھنا، تم سے نہ بڑھ جائیں کہیں
جوش ایسا چاہیئے اور ایسی ہمت چاہیئے

حکمراں ہو، کوئی ہو، اپنا ہو یا بیگانہ ہو
دی خدا نے جس کو عزت، اس کی عزت چاہیئے

دیکھ کر چلنا، کچل جائے نہ چیونٹی راہ میں
آدمی کو بے زبانوں سے بھی اُلفت چاہیئے

ہے اسی میں بھید عزت کا اگر سمجھے کوئی
چھوٹے بچو ں کو بزرگوں کی اطاعت چاہیئے

علم کہتے ہیں جسے، سب سے بڑی دولت ہے یہ
ڈھونڈلو اس کو ، اگر دنیا میں عزت چاہیئے

سب بُرا کہتے ہیں لڑنے کو بُری عادت ہے یہ
ساتھ کے لڑکے جو ہوں ، ان سے رفاقت چاہیئے

ہوں جماعت میں شرارت کرنے والے بھی اگر
دور کی ان سے فقط صاحب سلامت چاہیئے

دیکھنا، آپس میں پھر نفرت نہ ہوجائے کہیں
اس قدر حد سے زیادہ بھی نہ ملت چاہیئے

باپ دادوں کی بڑائی پر نہ اترانا کبھی
سب بڑائی، اپنی محنت کی بدولت چاہیئے

چاہتے ہو گر کہ سب چھوٹے بڑے عزت کریں
شرم آنکھوں میں نگاہوں میں مروّت چاہیئے

بات اونچی ذات میں بھی کوئی اترانے کی ہے ؟
آدمی کو اپنے کاموں کی شرافت چاہیئے

گر کتابیں ہوگئیں میلی تو کیا پڑھنے کا لطف
کام کی چیزیں ہیں جو، ان کی حفاظت چاہیئے

.....

آخر میں ایک دل چسپ واقعہ پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں ۔ اقبال ۱۹۳۱ء میں گول میز

کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تھے۔ اُس وقت ان کے فرزند جاوید اقبال کی عمر آٹھ برس کی رہی ہوگی۔ جاوید نے اقبال کو لاہور سے طفلانہ انداز میں ایک خط لکھ کر بھیجا تھا جس میں فرمائش کی تھی کہ جب آپ وطن لوٹیں تو آتے آتے میرے لیے ایک گراموفون لائیے۔ اقبال گراموفون تو نہیں لائے لیکن جواب میں ایک نظم بھیجی۔ جس پر لاکھوں گراموفون قربان کیے جاسکتے ہیں۔ یہ نظم آٹھ برس کے بچے کے لیے کہی گئی ہے لیکن اسے آٹھ سے لے کر ۸۰ سال تک کی عمر کے بچے پڑھ سکتے ہیں۔ سبق سیکھنے کے لیے تو کسی عمر کی قید ہی نہیں ہے۔ یہ نظم آپ نے بارہا پڑھی ہے۔ ایک بار اور پڑھیے اور لطف اُٹھائیے۔

## "جاوید کے نام"

(لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر!
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر!

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر!

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر!

میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر!

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے!
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر!

بچوں کے لیے اقبال کی نظمیں اُس شاعر بے مثال کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے مترادف ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے لیے اقبال کی ایک دعا کو یہاں نقل کر دیا جائے جو اُنھوں نے باپ کی حیثیت سے جاوید کے لیے کی تھی اقبال کے یہاں جاوید صرف اُن کے بیٹے کا نام نہیں ایک علامت ہے۔ ساری نئی نسل اُن کے لیے جاوید ہے۔ وہ اپنے کلام میں صرف جاوید سے خطاب نہیں کرتے بلکہ نژادِ نو سے مخاطب ہوتے ہیں اُن کے ہاتھ جب دعا کے لیے اُٹھتے ہیں تو وہ دعا صرف جاوید کے لیے نہیں ہوتی۔ آج کے ماحول میں اقبال کی یہ دعا ہر باپ کے دل کی پکار معلوم ہوتی ہے۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

○○○○○

ڈاکٹر یوسف اعظمی

# دو معاصرین.....اقبال اور ایلیٹ

بیسویں صدی کی دو قد آور شخصیتوں۔ اقبال اور ایلیٹ۔ میں زندگی کے وسیع تر مقاصد میں گہری مماثلت ملتی ہے۔ معاصرین ہونے کی حیثیت سے بیسویں صدی کی ذہنی، علمی، تہذیبی فضا میں ان کی نشو ونما ہوئی۔ ان دونوں کا جنم انیسویں صدی میں ہوا، تاہم ان کی شعوری زندگی بیسویں صدی پر محیط ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ۱۹۳۸ء میں اقبال کی زندگی کا چراغ گُل ہوگیا۔ ان کی زندگی کی آخری سانس تک ان کا توانا شاعر زندہ رہا۔ اس کے برخلاف ایلیٹ ۱۹۶۵ء تک زندہ رہے۔ تاہم دوسری جنگ عظیم کے بعد انہوں نے اپنی توجہ ڈراموں کی طرف مبذول کردی۔ اس طرح اقبال اور ایلیٹ کی شعری زندگی کا کینوس دوسری جنگ عظیم سے پہلے دیکھا جاسکتا ہے۔

بیسویں صدی کے ان دو بڑے معاصرین نے فلسفے کے شعبہ میں تربیت حاصل کی۔ اس ڈسپلن کے گہرے اثرات ان دونوں کی شاعری پر نظر آتے ہیں۔ اقبال نے فلسفہ عجم پر مقالہ پیش کر کے جرمن کی میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ ایلیٹ بھی فلسفے کے طالب علم رہے۔ انھوں نے اس وقت کے ایک اہم فلسفی ایف۔ ایچ۔ بریڈلے پر اپنا مقالہ مکمل کرلیا، تاہم یورپ کے لئے امریکہ سے ترک وطن کرنے کے بعد جنگ کے حالات نے انھیں دوبارہ امریکہ جانے کی اجازت نہ دی جس کی وجہ سے وہ ڈگری حاصل نہ کرسکے۔ دونوں کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں دانشورانہ روایات کا گہرا حصہ ہے۔

اقبال نے یورپ میں اپنے تعلیمی سفر کے دوران وہاں کی علمی وتہذیبی فضا سے نہ صرف اکتساب کیا بلکہ اس کی خامیوں کا بھی بھرپور جائزہ لیا۔ ان کی شاعری میں جہاں مغرب کی بے ہنگم زندگی پر تنقید ہے، وہاں اس کی فعالیت کو مشرق کے لئے ناگزیر قرار دیا۔ جس طرح اقبال کو یورپ دیکھنے کے وسیع تر مواقع حاصل ہوئے، ایلیٹ مشرقی دنیا کے علمی زندگی کے تجربوں سے دور رہے، تاہم مشرقی فکر، خاطر طور سے بدھ ازم اور اپنیشد کے گہرے اثرات ان کے شعری شعور کا حصہ بن

گئے۔ ہندوستانی فکر، ایلیٹ اور اقبال کی شاعری کا اہم عنصر ہے۔ اقبال نے بھی اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خاص طور سے اور عمومی حیثیت سے دوسرے دور میں، ہندوستانی فکر اور یہاں کے روحانی سرچشموں کو بنیادی اہمیت دی۔ دونوں شعرا کے ہاں مشرق اور مغرب کا حسین سنگم ملتا ہے۔ دونوں شعراء نے مغرب کی مادیت پرستی پر شدید تنقید کی ہے۔ دونوں کی تنقید میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال کا لہجہ جارحانہ ہے، جب کہ ایلیٹ نے علامتی انداز میں شعری ارتکاز کے ساتھ اپنے رویہ کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کے جارحانہ رویہ کی معقول وجہ تھی۔ ایک حریت پسند مفکر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے مغربی استعماریت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اقبال نے نئے مشرق کی وکالت کی ہے جب کہ ایلیٹ نے ایک نئے مغربی شعور کی ضرورت پر زور دیا۔ اس طرح دونوں نے مجموعی حیثیت سے مشرق اور مغرب کے صحت مند عناصر کا خوبصورت امتزاج عطا کیا۔

اقبال نے شاعری کے اظہار کے لئے اردو اور فارسی زبانوں کے سرچشموں سے اکتساب کیا۔ اسی طرح ایلیٹ نے انگریزی سے عبارت شاعری کے علاوہ فرانسیسی میں بھی شاعری میں مافی الضمیر کا اظہار کیا۔ یہ اور بات ہے کہ شاعری کی کوششیں بالکل ابتدائی نوعیت کی ہیں۔ جب کہ اقبال کا بڑا حصہ فارسی میں ملتا ہے۔

اقبال کی ابتدائی شاعری پر رومانیت کے اثرات ملتے ہیں۔ ایلیٹ نے اگرچہ کہ جدید شاعری کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا، مگر ہم ان کی ابتداء کی شاعری میں رومانیت کے اہم اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تنقید نگار کرموڈ نے جدیدیت کے اہم نقیب ہیوم اور ایذرا پاؤنڈ اور ایلیٹ میں رومانی اثرات کی واضح نشاندہی کی ہے۔

ایلیٹ کی ابتدائی شاعری میں تشکیک حاوی رہی، یہ تشکیک بھی دراصل، تلاش و جستجو کا نام ہے۔ ہمیں اقبال کی شاعری میں جستجو کا عنصر نمایاں ملتا ہے۔ اقبال نے Stray Reflection میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ورڈزورتھ نے ان کو دہریت سے بچالیا۔ وہ کچھ عرصہ تک تشکیک کے مرحلے سے گزرے ہیں۔ بقول بادلیر تشکیک کے بعد اعتقاد میں مزید گہرائی اور استناد پیدا ہوتا ہے۔ غلامی سے بدتر بے یقینی سے نجات ملتی ہے۔

دونوں کی شاعری کے جائزہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے شاعری کے سرمایہ میں قدامت پسندی، اور کٹرپن میں آفاقی قدروں کو اپنایا۔ مگر یہ عجیب امتزاج ہے کہ دونوں کی نثری تحریروں میں عیسائی اور اسلامی میتھالوجی کی پرزور وکالت ملتی ہے۔ ایلیٹ نے اپنی شاعری میں humility کو حکمت قرار دیا۔ یہ ان کی شاعری اس کی واضح مثال تھی مگر ان کی نثری تحریروں کا ایک دور (Intellectual arrogance) ''دانشورانہ جارحیت'' کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

ایلیٹ اور اقبال دونوں نے فرد اور سماج کے لئے روحانی ذرائع سے انقلاب کی تمنا کی۔ ایلیٹ کا خاندان Unitarianism کا قائل تھا۔ جس میں عیسائی عقیدہ تثلیث کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ابتدائی زندگی میں وہ اس سے مربوط رہے تاہم بعد میں انہوں نے Anglo-Catholic مسلک قبول کرلیا۔ اس کے بعد ان کی شاعری روحانی سرچشموں سے مربوط ہوگئی جب کہ ابتدائی شاعری میں Myth اور علم انسانیت کے نقوش ملتے ہیں۔ اقبال کی ابتدائی شاعری میں حب الوطنی کے نغمے، فطرت کے گیت ملیں گے اور اس کے بعد مذہبی حسیت کا واضح موڑ ملتا ہے۔ اس طرح دونوں شاعروں کے شعری سفر میں ہمیں بڑی یکسانیت ملتی ہے۔

اقبال اور ایلیٹ نے بے شمار اثرات قبول کئے مگر اپنی اُپج Originanality اور منفرد مزاج کو برقرار رکھا۔ انہوں نے انہی عناصر کو اپنی فکر میں شامل کیا جو ان کے بنیادی فکری ڈھانچے سے متصادم نہیں ہوتے تھے۔ ایلیٹ کے ہاں علم انسانیات، فرانسیسی شاعری، کلاسیکی شعراء مابعد الطبیعاتی شعرا اور جدید مفکرین کے خیالات کے علاوہ عیسائی فکر کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اس طرح اقبال نے بھی مشرق اور مغرب کے ادب سے اکتساب کیا۔ جدید مفکرین کے علمی نتائج کو اپنی فکر کا حصہ بنایا۔ اسلامی ورثہ کو اپنی فکر کی اساس بنا کر ایک روشن خیال دانشور کی طرح انہوں نے مذہب کی تعبیر و تشریح کی۔ ان کی انگریزی کتاب (Reconstruction of Religious Thought in Islam)، جو سات لکچرس پر مشتمل ہے، اس بات کی شہادت دیتی ہے۔ انہوں نے اجتہاد کی اہمیت پر واضح انداز میں زور دیا ہے اور اپنے فقہی ڈھانچوں کی از سر نو جانچ کی وکالت کی ہے۔ اقبال کے اس روشن خیال انداز کے برخلاف، ایلیٹ عیسائی قدامت پسندی کے ترجمان نظر آتے ہیں۔

عشق کو دونوں کی شاعری میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ اقبال نے عشق کو کائنات کی تسخیر اور انسانی ارتقاء کے لئے ناگزیر قرار دیا۔ ایلیٹ نے عیسائی فکر میں عشق کی بنیادی اہمیت پر زور دیا ۔ دونوں نے عشق کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا کہ وہ آرٹ کا جز لاینفک بن جاتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں عشق اور عقل کے درمیان کشاکش کی تصویریں ان کی شاعری کے بڑے حصے پر محیط ہیں۔

اقبال اور ایلیٹ نے کلچر کو اپنی شاعری اور نثری تحریروں کا مرکزی موضوع بنایا ہے۔ مذہب اور کلچر دو وسیع تر اصطلاحیں ہیں۔ ان کے ابعاد متعین کرنے میں ابھی ہمیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اسی لئے بعض کلچر کو وسیع تر اصطلاح تصور کرتے ہیں تو بعض مذہب کو۔ دونوں کے ہاں کلچر پر بہت زور دیا گیا ہے۔ مگر ان کے تصورات کبھی مذہبی فکر کے وسیع تر ڈھانچے سے متصادم نہیں ہوتے۔ اس صدی کے اہم ماہر سماجیات ساروکن (Sorokin) نے کلچر کو انسانی سماج کے پس منظر میں (ideational) اور (sensate) کلچر کے خانوں میں تقسیم کیا۔ (sensate) کلچر مادیت سے مربوط ہے جب کہ (ideational) کلچر نظریاتی سطح پر مادّیت کا شکار نہیں۔ ایلیٹ اور اقبال دونوں نے موجودہ معاشرہ کو Sensate Culture سے مربوط کرتے ہوئے اس پر سخت تنقید کی۔

ایلیٹ اور اقبال کی شاعری میں (Mysticism) کو بڑی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تاہم دونوں کی شاعری میں عیسائی اور اسلامی فریم ورک میں اس کا ظہور ملے گا۔ اقبال نے تصوف سے گہری وابستگی کا ثبوت دیا تاہم وہ خانقاہیں جو از کار رفتہ ہوگئی ہیں اور تصوف کے وہ ادارے، جو فعال درس زندگی دینے کے بجائے مجہول راستوں کی نشاندہی کرتے رہے ہیں، اقبال کی سخت تنقید کا نشانہ بنے۔

تصور وقت کو دونوں کی شاعری میں اہم مقام حاصل ہے۔ ایلیٹ نے اپنی شاعری کی ساخت میں وقت کو برتا ہے۔ اقبال نے اپنی نثری تحریروں اور شعری سانچوں میں وقت کی اہمیت کو پیش کیا۔ فارسی اور اردو شاعری میں بے شمار اشعار اس کی اہمیت کو روشناس کرواتے ہیں۔

اقبال اور ایلیٹ کے پاس گہرا تاریخی شعور ملتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔ ''میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو'' لیکن یہ جستجو کسی تاریخی لمحے میں دوبارہ واپس لوٹنے کی نہیں تھی

بلکہ وقت کے اس دھارے سے مضبوطی سے اپنا رشتہ قائم رکھ کر نئے جہاں کی تخلیق کی آرزو تھی۔ اس لیے اقبال احیاء پسند نہیں کہلائے جاسکتے۔ انہوں نے تجربہ اور آنے والے کل کو نظر انداز نہیں کیا۔ وہ شاعرِ فردا تھے۔ جوانوں کو پیروں کا استاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ایلیٹ کی شاعری میں تاریخ اور تجربہ کا خوصورت امتزاج ملتا ہے۔ ایلیٹ نے جدیدیت کے فروغ میں نمایاں رول انجام دیا۔ تاہم انہوں نے ماضی کی ماضیت پر، جو حال سے مربوط رہے، کافی زور دیا ہے۔ ان کی نثری تحریروں، خاص طور سے عیسائی نقطہ نظر کی ترجمان نگارشات میں وہ خوبصورت توازن کم کم ہی نظر آتا ہے۔ اس کے کلچر میں پیوستہ جڑیں، مذہبی فلسفہ اور شعری تجربوں میں ملے گی۔ اس میں وجودی تشویش بھی ملے گی۔ وجودی تشویش ہمیں اقبال اور غالب کے ہاں ملتی ہے۔ اگر چہ کہ خالصتاً وجودی مفکرین کی حیثیت سے ان کی شناخت مشکل ہے۔ بیسویں صدی میں وجودی فکر نے ہماری حیثیت اور فکر کو متاثر کیا ہے مگر وجودیت ایک تحریک کا روپ اختیار کرنے سے پہلے بھی فنکاروں کے ہاں اس کے واضح اشارے ملتے ہیں۔

جمہوریت، مارکسزم، فسطائیت، صیہونیت، انسان اور سماج کے رشتوں انفرادی انا، اجتماعی انا کے اُمور پر قدرے اختلاف کے باوجود مشترک اندازِ فکر ملتا ہے۔ ایلیٹ نے اپنی فکر اور شاعری کے ذریعے مغربی اور مشرقی ادب پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ہندوستانی ادب، فارسی ادب، عربی ادب اور روسی شاعری پر بھی ان کے واضح اثرات کا پتہ ملتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ شاعر جوزف براڈسکی نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ ایلیٹ کو ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں 1948 میں نوبل انعام دیا گیا جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔ تاہم نوبل کمیٹی کے طریق کار، سلکشن کمیٹی کے رویے، مشرقی ادب سے کم واقفیت اور بقول نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنسدان عبدالسلام، یہودی عصبیت کی کارفرمائی صحیح فیصلوں میں مزاحمت پیدا کرتی ہے۔ اقبال کو توقع تھی کہ جاوید نامہ پر جو ان کی شعری اور فکری ارتقاء کی اہم کڑی ہے، نوبل انعام مل جائے گا مگر وہ حالات، جس کا میں نے ذکر کیا، شاید مزاحم رہے۔

ہم نے ایلیٹ اور اقبال کے نقطہ نظر کا تقابلی جائزہ لیا۔ آیئے ان دونوں کی تخلیقی کائنات (Poetic Universe) کی کچھ دیر کے لئے سیر کریں تا کہ ہم سب تخلیق کا سحر خود محسوس کریں۔ دونوں شاعروں کی اپنی اپنی تخلیقی دنیا کی انفرادیت اور مشترک قدروں کا مشاہدہ کریں۔

اقبال نے مغربی تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا وہ ناپائیدار ہوگا

ایلیٹ نے یورپی تہذیب کے ٹوٹے ہوئے شیرازہ کو(Gerontion) میں ایک بوڑھے سے تعبیر کیا۔

Here I am,an old man in a dry month,

ویسٹ لینڈ (خرابہ) میں ہمارے عہد کی المناک داستان سنائی دیتی ہے جو ٹوٹے امیجس کا ڈھیر ہے۔

اقبال نے زمانہ اور تقدیر سے متعلق اپنے نقطہ نظر کا یوں اظہار کیا ہے۔

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روزوشب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

(Chorus) میں ایلیٹ نے جبر اور وقت سے متعلق اس طرح شعری پیرایہ اپنایا ہے:

Then came, at a predetermined moment, in time and of tine, A moment not out of time,in what we call history:
transecting, bisecting the world of time.

فورکوارٹرٹیس' ایلیٹ کی شہرہ آفاق نظم ہے جو وقت کے محور پر گھومتی ہے۔

Time Present and Time Past
Are both Perhaps Present in the future.
And time future contained in time past.
If all time is eternally present
All time is unredeemable.

اقبال نے وقت کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔ وہ وقت کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔

سلسلۂ روز وشب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز وشب ' اصل حیاتِ وممات

عشق' ایلیٹ اور اقبال کی شاعری میں بنیادی محرک ہے۔ ایلیٹ کہتے ہیں:

Love is the Unfamiliar Name
Behind the hands that wore
The intolerable shirt of flame
Which human power can not remove
We only live,only surprise
Consumed by either fire or fire.

اقبال نے عشق و عقل کی کشمکش میں' عقل پر عشق کی برتری کا احساس دلایا ہے۔ محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے' صحرا بھی' جرس بھی' کارواں بھی۔ راہبر بھی۔ رہزن بھی

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات' عشق سے نارِ حیات
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق — معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق
تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا — عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بولہب

بڑا شاعر' موت اور زندگی کے مسائل پر غور کرتا رہا ہے۔ ایلیٹ نے موت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

Those who sharpen the tooth of dog, meaning
Death
Those who gutter with thc glory the humming bud,meaning
Death
Those who sit in the sky of contentment,meaning
Death
Those who suffer the ecstacy of the animals, meaning
Death

اقبال نے زندگی اور موت پر بے شمار اشعار اور نظموں کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
زندگی انسان کی اک دَم کے سوا کچھ بھی نہیں
دَم ہوا کی موج ہے' دَم کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات

یہ کبھی گوہر، کبھی آنسو ہوا
فرشتہ موت کا چھوتا گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

ایلیٹ کے ہاں رومانی حسیت سے زیادہ جدید حسیت کی کارفرمائی ہے۔ انہوں نے اظہار کو نئی وسعت بخشی۔

Let us go then you and I
When the evening is spread out against the sky
Like a patient etherised on a table.

شام کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ رومانی اندازِ فکر سے مختلف ہے۔ یہاں شاعر نے نئے معانی پہنائے ہیں۔ اقبال بنیادی طور پر (Utopian) اور نصب العینی شاعر تھے۔ رومانیت ان کی حسیت کا نمایاں پہلو ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگین اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینہ زرّیں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں
زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

سماجی، تہذیبی، ادبی نقطہ نظر سے اقبال کی معنویت ہمارے لئے زیادہ ہے۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا''۔ ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ ترانہ نہ صرف ہندوستان کی فضاؤں میں گونجتا رہا ہے بلکہ خلاؤں میں بھی اس کی آواز پھیلی۔ ستاروں کی رہ گذر پر یہ نغمہ گونجا۔

اقبال اور ایلیٹ کے ہاں انسان کی تصویر قدرے مختلف ہے۔ ایلیٹ کی ابتدائی شاعری میں قنوطیت کا رجحان زیادہ نمایاں ہے۔ شاعر نے کھوکھلے انسان کا جو تصور "The Hollow Men" میں پیش کیا ہے وہ عصر حاضر کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔

اقبال نے عصرِ حاضر کے اس کرب کو نئے مُثبت معنوں میں اس کے امکانات میں ڈھونڈا۔ اقبال انسان کو تخلیق میں خدا کا شریک' اور اس کا فعال نائب قرار دیتے ہیں۔ ان کے شعروں میں انسان کی تصویر اس طرح جھلکتی ہے۔

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت ' سرگرمِ تقاضا ہے
اس ذرّہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرّہ نہیں ' شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ کامل نہ بن جائے
تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کُہسار و راغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم
قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جُو بنایا راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بے تاب ہے ذوق آگہی کا کھلتا نہیں بھید زندگی کا

اقبال اور ایلیٹ کی دانشوری اور شاعری کے ذریعے انسانی فکر کے قافلے کو جو دین ہے' وہ بڑی اہم ہے۔ یہ دو معاصرین ہمارے شعور اور ادبی تہذیبی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں۔

○○○○○

پروفیسر یم یم تقی خاں

# ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

(محفل اقبال شناسی منعقدہ ۱۹ر فروری ۲۰۰۳ء میں کی گئی تقریر)

علامہ اقبال کے جس مصرع کو میں نے آج کی تقریر کا موضوع بنایا ہے وہ اپنے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے بہت وسیع ہے اور اکیسویں صدی کا شاید عصری موضوع ہے۔ اس مصرع کا ایک عام فہم مفہوم جو بیان کیا جاتا ہے وہ انسانی جدوجہد اور سعی کا ایک لامتناہی اور نہ ختم ہونے والا سفر ہے جہاں ہر قدم پر انسان کے ارادہ، ثابت قدمی اور عزم و استقلال کا امتحان ہے۔ شاعر اِسے عشق کا امتحان کہتا ہے ''ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں''۔ عشق صبر بھی ہے، عزم و استقلال بھی ہے اور معرکۂ حیات میں بھی امتحان ہے۔

صبر حسینؓ بھی ہے عشق، صدق خلیلؑ بھی ہے عشق
معرکۂ حیات میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اس سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

قناعت نہ کر عالم رنگ و بُو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہین ہے، پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اس چار ابعادی عالم کو اقبال عالم رنگ و بو سے تعبیر کر رہے ہیں کہ تو اِس پر قناعت نہ کر کیوں کہ تیرے لئے اور بھی کئی زماں و مکاں ہیں۔ عالم رنگ و بو کی شناخت مادّہ اور توانائی سے ہے۔ ستاروں سے آگے جہاں اِس عالم رنگ و بو کے جہاں نہیں ہیں بلکہ ایسے جہاں ہیں جن کے زماں و مکاں بالکل الگ ہیں اور مختلف ہیں۔ جن کی رنگ و بو کی کیفیت الگ ہے اقبال نے جب یہ نظم لکھی تھی اس وقت آئنسٹائن کا خاص اور عام نظریہ اضافیت اتنا مقبول نہیں تھا۔ خاص نظریہ اضافیت کی رو سے اِس کائنات کے چار ابعاد اور عام نظریہ اضافیت کے لحاظ سے ثقل کی

حیثیت اور زماں ومکان پر اس کا اثر آئنسٹائن کے فکر ونظر کے انقلابات تھے۔ مختلف الا ابعادی زماں ومکان اور ستاروں کے آگے جہاں' اس وقت انسان کے علم میں نہیں تھے (۱) اقبال کا الہامی کلام بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اکیسویں صدی کی اہم تحقیق کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ آج ہم ستاروں سے آگے والے زماں ومکان اور جہاں پر غور کریں گے جہاں انسان اپنی فکر ونظر کی بنیاد پر پہنچ چکا ہے لیکن وہ اب بھی اس کی دسترس سے باہر ہیں (۲) ستاروں سے آگے جہاں اور عوالم اسلامی عقیدہ کی بنیاد ہیں۔ قرآن کی ابتدائی آیت الحمد اللہ رب اللعلمین ''اُس اللہ کی حمد جو عالمین کا رب ہے''، عالم کے رب کی نہیں بلکہ عالمین کے رب کی حمد بیان کی گئی۔ رب کا مطلب پیدا کرنے والا اور پالنے والا اور درجہ کمال کو پہنچانے والا ہے۔ اسی طرح پیغمبر آخرؐ رحمت اللعالمین ہیں سارے عوالم کے لئے رحمت ہیں۔ عوالم پر غور کرنے سے پہلے چلئے ہم اپنے عالم پر غور کریں تا کہ ستاروں سے آگے جانے کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔ انسان جس وقت سے زمین پر آیا ہے اس کے پیش نظر یہ سوال رہا ہے کہ چاند' ستارے اور کہکشاں کب سے ہیں؟ ارسطو نے کہا تھا کہ اللہ اور کائنات دونوں قدیم ہیں۔ اور اب بھی مادّی تثلیث کا قائل انسان اللہ' روح اور مادّہ کو قدیم جانتا ہے۔

نیوٹن نے زماں ومکان کو ایک مطلق حقیقت جانا اور اپنے حرکت کے قوانین وضع کئے اور یہ نتیجہ نکالا کہ قدرت کے قوانین ایک مکمل مشین کی طرح ہیں۔ یہ مادّی جبریت کے دور کی ابتدا تھی کہ کائنات کے رب کی کوئی ضرورت نہیں۔ ۱۹۰۵ء میں آئنسٹائن نے خاص نظریہ اضافیت کی بنیاد پر انکشاف کیا کہ زمان ومکاں مطلق نہیں بلکہ اضافی ہیں اور شاہد کی رفتار اور احوال پر منحصر ہیں (۳) یہ ایک سائنسی انقلاب تھا' اقبال فرماتے ہیں:

احوال و مقامات پر موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

زماں ومکاں ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت ہیں۔ زماں، مکان کا ایک چوتھا بعد ہے۔ اس طرح جو لوگ سہ ابعادی مکان کے عادی تھے زماں کو بھی ایک بُعد کی حیثیت سے جاننے لگے۔ زماں، مکان کا ایک خیالی بُعد ہے۔ زماں ومکاں کے چار ابعاد کو سمجھنے کے لئے میں ایک چھوٹی سی مثال دینا چاہتا ہوں۔ آپ کسی کو کسی مقام کا پتہ دینا چاہتے ہوں کہ کہیں گے کہ فلاں اور فلاں سڑکوں کے تقاطع (Intersection) پر جو بلڈنگ ہے اس کی

دوسری منزل پر۔ یہ مکان کے تین ابعاد ہوئے اور میٹنگ ٹھیک چار بجے ہوگی۔ یہ زماں کا بُعد ہوا۔ اس کے بعد ہی کوئی وہاں ٹھیک وقت پر پہنچ سکتا ہے۔ مکان کے بُعد کو آپ زماں میں بھی تبدیل کر سکتے ہیں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ محفل کے انعقاد کی جگہ آپ کے گھر سے اس رخ پر پندرہ منٹ کے ڈرائیونگ وقت پر ہے۔ اس طرح آپ فاصلہ کو وقت میں تبدیل کر رہے ہیں۔ کائنات کے عظیم ساختوں کو ظاہر کرنے کے لئے نور کی رفتار کا سہارا لیا جاتا ہے۔ نور ایک سکنڈ میں 186,000 میل یا 300,000 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ اس طرح ایک فٹ کا مطلب ہوگا نوری ثانیہ کا ایک ارب واں حصہ۔ سورج ہم سے 500 نوری سکنڈ دور ہے۔ فاصلوں کو اگر ہم نور کی رفتار کے پیمانے میں ناپیں تو پورا نظام شمسی دس یا بارہ نوری گھنٹوں میں طے ہو جائے گا۔ ہم سے قریب ترین ستارہ چالیس نوری سال دور ہے۔ کائنات کا پھیلاؤ پچاس ارب نوری سال ہے (ایک نوری سال ۲۵ کھرب میل ہے یعنی 25,00,000,000 میل)۔

آئنسٹائن کے استاد Minkowski نے بتلایا زماں و مکاں کے ابعاد کو ہم ایک ترسیم کے ذریعہ ظاہر کر سکتے ہیں۔ نوری فاصلہ کو آپ ترسیم کا ایک دھرا axis اور وقت کو دوسرا دھرا مقرر کریں تو نور کی رفتار اس کا وتر (diagonal) ہوگا۔ اس وتر کے اندر وہ سارے اجسام کا سفر ہوگا جن کی رفتار نور سے کم ہے۔ اس علاقہ کو Time-Zone کہتے ہیں۔ اس علاقہ میں ایک متحرک جسم کی تاریخ، پیدائش سے ختم ہونے تک ایک ترسیم کی شکل میں رہتی ہے جسے World line کہتے ہیں۔ اس Zone میں اشیاء کی رفتار نور کی رفتار سے زیادہ ہوگی۔ اس Zone کی خاصیت یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں جسم کئی مقامات پر پایا جا سکتا ہے۔ ہر World line ماضی سے اور پھر مستقبل کی طرف ایک ہی سمت میں سفر کرتی ہے اور یہ ایک دوسرے کو قطع نہیں کر سکتی۔ اس لئے علت اور اثر کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے اور کوئی ماضی کی طرف نہیں جا سکتا۔

آئنسٹائن کی دوسری اہم تحقیق قوت ثقل کی ماہیت کے متعلق تھی جس میں انہوں نے بتلایا کہ زماں و مکاں، کائنات میں ایک اکائی کی طرح جُڑے ہوئے ہیں اور مادّہ اُن پر اثر انداز ہوتا۔ آئنسٹائن نے اپنے عام نظریہ اضافیت کی بنیاد پر دریافت کیا کہ مادّہ، زماں و مکان میں پیچ و خم پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ کسی مسطح چادر پر کوئی وزنی چیز ڈال دیں تو چادر جس طرح مُڑ جاتی ہے اسی طرح زماں و مکاں کی چادر مادّہ سے متاثر ہوتی ہے۔ جتنا مادّہ کثیف ہوگا اُسی تناسب سے یہ پیچ و خم بڑھ جاتا ہے۔ قوت ثقل دراصل زماں و مکاں کا پیچ و خم ہے۔ ایک اونچائی کے مقابلہ میں گہرائی میں یہ

زیادہ ہو جاتا ہے۔آپ کے سر اور پاوں کے درمیان ثقل کا فرق اتنا رہتا ہے کہ آپ کھڑے ہو سکتے ہیں ورنہ انسان زمین سے اُٹھ بھی نہ سکتا۔وقت کی رفتار اس پیچ وخم کے بڑھنے سے ست ہو جاتی ہے اور اس کی کمی سے بڑھ جاتی ہے۔(۴) ایک بلند مینار کی بلندی پر گھڑیاں ست رفتار ہو جاتی ہیں۔اگر مادّہ کی کثافت لامتناہی ہو جائے تو زماں ومکان بھی سکڑ کر ایک نقطہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔اسی کو Black hole کہا جاتا ہے۔Gravitation کے اثر سے جب ستارے سکڑ جاتے ہیں تو ان کی کثافت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔وہاں زماں ومکاں اتنے سکڑ جاتے ہیں کہ ان کی کمیت تقریباً صفر ہو جاتی ہے۔

چار ابعادی کائنات میں زماں ومکان کی ساخت پر مادّہ اثر انداز ہوتا ہے اور پیچ وخم پیدا کرتا ہے۔نور کی رفتار اس کائنات میں مستقل ہے۔نور ایک برقی مقناطیسی موج ہے جو ذرات کی شکل میں آگے بڑھتی ہے۔اس کی رفتار اور ترسیل کے لئے Maxwell نے چند مساواتیں دریافت کیں، جو نور کی میدانی مساوتیں کہلاتی ہیں۔اس طرح Einstein نے ثقل کے لئے چند مساواتیں دریافت کیں جو عام نظریہ اضافیت کی مساواتیں کہلاتی ہیں۔ثقل کا زماں ومکاں پر اثر ہوتا ہے لیکن نور کی رفتار پر نہیں، جو، ہر حیثیت سے مستقل ہے۔Kaluza نے نور کی مساواتوں اور ثقل کی مساواتوں کو ایک عمومی ریاضی کے ڈھانچہ میں ڈھال کر یہ ثابت کیا کہ نور دراصل ایک پانچویں بُعد کی مخلوق ہے۔(۵) یہ ہماری چار ابعادی کائنات پر اس طرح اثر انداز ہو رہی ہے کہ اس کی رفتار مستقل ہے۔یہ پانچواں بُعد ایک خیالی بُعد ہے جو نور کی رفتار کی تشریح کر سکتا ہے۔ پانچواں بُعد ایک فوق المکان Hyper Space کا حصہ ہے جو ریاضی کی مساواتوں سے حاصل ہوتا ہے۔اس کا ہم ذہنی تصور نہیں کر سکتے کیوں کہ ہمارے ذہن کا چوکھٹا سہ ابعادی ہے۔ ہمارے لئے چار ابعادی کا بھی شعور مشکل ہو جاتا ہے۔چہ جائکہ ہم پانچویں بُعد کا تصور کریں ریاضی کی مساوات کے ذریعہ جیسے جیسے ہم ابعاد کی کثرت کی طرف جائیں گے اسی مناسبت سے مظاہر کی تشریح آسان ہو جائے گی۔پانچویں بُعد کے ذریعہ ہم نور کی برقی مقناطیسیت اور زماں ومکاں دونوں بیان کر سکتے ہیں۔لیکن اس میں مادّہ شامل نہیں ہے۔اگر ہم مادّہ کے مرکزہ کے کمزور اور طاقتور قوتوں کو بھی یکجا کر لیں تو پانچ ابعاد کافی نہیں ہوں گے۔اس کے لئے دس ابعاد کی ضرورت ہوگی۔اس دس ابعادی زماں ومکاں جس کو ہم فوق المکان کہتے ہیں۔زماں ومکاں اور مادّہ کی خلقت کو ایک سادہ مساوات کی شکل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اس مساوات نور کو تشکیل دینے اور اسے حل کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ (۵) یہ مساوات اللہ کے ارشاد "کُن فیکُون" کی تشریح ہوگی۔ وہ خالق کائنات جو زمانِ سرمد اور مکانِ سرمد کا خالق ہو اور جس کو ہم "ھو الاول و الاخر و الظاھر و الباطن" سے مخاطب کرتے ہیں، اس فوق المکانی کائنات جس کے دس ابعاد ہوں خلق کرسکتا ہے۔ اسی حکم "کن فیکون" کے ذریعہ زماں ومکاں کے ابعاد مقرر ہوتے ہیں اور جتنے ابعاد کی ضرورت ہے اتنے ابعاد پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح ابتداء کائنات کے وقت دس ابعادی فوق المکاں ہمارے چار ابعادی عالم اور ایک چھ ابعادی متوازی عالم میں تبدیل ہوجاتا ہے ـ ـ ہمارا چار ابعادی عالم رنگ و بُو پھیلنے لگتا ہے اور چھ ابعادی عالم سکڑنے لگتا ہے۔ قادر مطلق اسی طرح کثیر الابعادی زماں ومکاں سے کئی اور کائناتیں خلق کرسکتا ہے۔ اس لئے اقبال فرماتے ہیں:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کُن فیکون

"ستاروں سے آگے والے جہاں" وہ لامتناہی امکانات ہیں جو ایک کواٹم مساوات سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس مساوات کا حل مادّہ کی وہ سارے امکانی وجود ہیں جو حاصل ہوسکتے ہیں اور یہ لامتناہی ہیں۔ اس کا ہر حل ایک نیا عالم ہے (۴) یہ سارے عوالم امکانی ہیں جو مشیّت قدرت میں رہتی ہیں لیکن وہی وجود عمل میں آتا ہے جسے شاہد کائنات دیکھنا چاہتا ہے۔ امکان سے وجود میں آنے کے لئے ایک شاہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں شاہد وہ قادر مطلق ہے جو ہر شئے پر شاہد ہے (۶) "ان اللہ علی کُلِ شئی شھید" (الحج ـ۲۲: ۱۷)

ہر عالم کا وجود ہے۔ وہ امکانات جو وجود میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور ایک خاص قسم کے وجود میں جس میں زماں و مکاں کے ابعاد کا تعین ہو اور جو کسی اور وجود کے لئے اسباب فراہم کرسکے۔ اللہ کے حکم "کن فیکون" کے پابند ہیں۔ ان امکانات کو وجود میں تبدیل ہونے کے لئے کسی اسباب کی فراہمی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اللہ کی قدرت کاملہ بغیر کسی اسباب کے اور بغیر کسی شئے کے امکان کو وجود میں تبدیل کرسکتی ہے۔ یہی ہمارے عالم اور دوسرے عوالم کی ابتداء ہے۔ کس عالم کے لئے کتنے ابعاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" اللہ کا علم ہر شئے پر محیط ہے" (الطلاق ـ۶۵: ۱۲) اگر ہمارا عالم چار ابعاد کی بجائے پانچ ابعادی ہوتا تو قوتوں کا جو تناسب اور مظاہر فطرت کی باریکی جو حیات کو برقرار رکھنے کے لئے کافی ہے۔ وہ باقی

نہیں رہتی ۔ اور یہ کائنات رنگ وبُو پیدا نہیں ہوسکتی (۲) دوسرے عوالم کے ابعاد شاید وہاں کی مخلوق اور وہاں کے حالات کے لحاظ سے ہو۔ قرآن میں جنّات کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں آگ سے جو energy یا توانائی سے خلق کیا گیا ہے۔ ہمارا عالم امکان مادّہ کی بقا کے لئے ایک اور عالم ہے جس کے ابعاد بالکل الگ ہیں۔ اسی طرح ارواح اور ملائکہ کے لئے اور عوالم ہیں۔ یہ سب عوالم ہر آن اللہ کی قدرت کاملہ سے پیدا ہو رہے ہیں اور فنا بھی ہو رہے ہیں۔

اللہ کے قدرت کاملہ کی معمولی مثال ہمارا نفس ہے۔ جب ہم کسی امر کا ارادہ کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس کے کئی امکانات ہوتے ہیں اور ہر امکان اپنی جگہ پر ایک عالم ہے۔ یہ سارے عوالم بہ یک وقت ہمارے ذہن میں ہیں۔ لیکن وہی امکان وجود میں بدل جاتا ہے جس پر ہم عمل کرتے ہیں (۵)۔ یہی ہماری تقدیر ہو جاتی ہے۔ اس عمل اور یقین میں خود ہمارا ارادہ اور اللہ کی مرضی دونوں شامل ہیں۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ وخشت نہیں، جو تری نگاہ میں ہے

---

حوالہ جات:


(1) Adair Robert, K., "The Great Design,Particles Fields and Creation, Oxford university press (1987)

(2) Kaku,Michio, Hyperspace, Anchor Books, Doubleday, New York,(1994)

(3) Einstein, Albert, Essays in Science, Philosophical Library, N.Y.(1934)

(4) Bergmann.Peter. G.,The Riddle of Gvavitation. Dover Publication, I nc . N.Y.(1992)

(5) Wolf F.A. Paralled Universes; Simon & Schuster , N.Y (1988)

(6) Herbert.N. Quantum Reality; Anchor Books.N.Y (1987)


OOO

پروفیسر یم یم تقی خاں

# یہاں کارواں اور بھی ہیں

(محفلِ اقبال شناسی منعقدہ ۲۶ر فروری ۲۰۰۳ء میں کی گئی تقریر)

ہماری کائنات قدیم نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیق ۱۴، ارب سال پہلے ایک دھماکہ کے ذریعہ ہوئی جسے Big Bang کہتے ہیں ۔ آج ہم خلقتِ کائنات پر غور کریں گے تاکہ اور بھی کاروانوں اور ممکنات پر روشنی پڑ سکے۔

کائنات کے حادث ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہبل Hubble کی ۱۹۲۲ء کی دریافت ہے کہ دور دراز کہکشانوں کی روشنی ان کی دوری کے لحاظ اور نسبت سے سرخی مائل ہوتی جاتی ہے ۔ کہکشاں جتنی دور ہوگی یہ روشنی اُتنی ہی زیادہ سرخ ہوگی ۔اس کو ''سرخ تبدیلی'' یا red shift کہتے ہیں ۔اس مشاہدہ سے ہبل نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ستارے اور کہکشاں ہم سے دور جارہے ہیں اور کائنات مسلسل پھیل رہی ہے ۔ کائنات میں ستارہ یا کہکشاں جتنی دور ہوگی اُتنی ہی تیزی سے ہم سے دور جارہی ہے ۔ کائنات میں کسی بھی نقطہ کو ہم مرکز مان لیں تو کائنات کے پھیلنے کی رفتار ہر سمت میں متوازن اور یکساں ہوگی ۔ زماں و مکاں میں جو مادّہ پھیلا ہوا ہے پھیلاؤ کی وجہ سے اس کا ارتکاز یا دباؤ کم ہوتا جاتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ پھیلنے کا عمل کب سے ہو رہا ہے ۔ اگر ہم اس نتیجہ کو مخالف سمت میں لے جائیں تو ایک ایسا مرحلہ آئے گا جہاں سے اِس پھیلنے کا عمل شروع ہوا تھا ۔ آئنسٹائن کے عام نظریہ اضافیت کی بنیاد پر Fredman نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کائنات کے پھیلنے کی رفتار، مادّہ کی کثافت اور فضاء میں اس کے ارتکاز پر مُنحصر ہے ۔ اگر ہم پھیلنے کے عمل کی مخالف سمت جائیں تو مادّہ کی کثافت اور اس کا ارتکاز بڑھتا جائے گا اور اگر ہم اسے صفر وقت کی طرف لے جائیں تو ہم ایسے ابتدائی ریاضی نقطہ کی طرف پہنچ جاتے ہیں جس کا قطر تقریباً صفر ہوگا اور وہاں مادّہ کی کثافت لامتناہی اور تپش کروڑوں سورج کے برابر ہوگی (!) اس نقطہ کو ریاضی کی زبان میں نقطۂ واحد یا singularity کہتے ہیں ۔ طبعی لحاظ سے ایک ایسا نقطہ جس کا نقطہ صفر ہو جو صفر زماں میں ہو یعنی زماں و مکاں کی ابتداء سے پہلے ہو سمجھ سے باہر ہے ۔ یہی

لاشئے ہے جس کو اللہ کا امر کہہ سکتے ہیں۔ خلقت کی ابتداء ایک دھماکہ کے ذریعہ ہوئی جو اس صفر وقت کے لحاظ سے 10-45 سکنڈ میں ہوا۔ وقت کے اس وقفہ کو Chronon کہتے ہیں جو زماں کی اکائی ہے۔ یہ ابتداء ایک چھوٹے نقطہ کے ذریعہ ہوئی جس کا قطر 10-33 سمر تھا۔ یہ مکان کی اکائی ہے۔ زماں اور مکاں کی ان اکائیوں کو پلانک کا مکان کہتے ہیں۔ انسانی علم میں اس سے چھوٹا وقفہ یا اس سے چھوٹی لمبائی ممکن نہیں ہے۔ یہ زماں و مکاں کی ابتداء ہے اور اس سے پہلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کائنات کے اس نقطہ میں زماں و مکان اور مادّہ آپس میں ملے ہوئے ایک ایسی حالت میں تھے جسے کوانٹم کف کہتے ہیں (۱)۔ یہ خلقت کی وہ ماہیت ہے جس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسے حالات جب کائنات کی ابتداء ہوئی تھی' زماں میں پھر پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ اس نقطہ کا شاہد اور خالق صرف پروردگار عالم ہے۔ زماں و مکاں اور مادّہ کی اس ملی ہوئی حالت کو قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''کیا اللہ کا انکار کرنے والے نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین سب آپس میں ملے ہوئے پھر ہم نے ان کو جدا کر دیا ہے (الانبیاء ۲۱:۳۰) کائنات کی تشکیل چھ ادوار میں ثانیہ کے ایک چھوٹے حصہ 10-45 سکنڈ سے شروع ہو کر ایک ارب سال کی مدت میں مکمل ہوئی۔

دوسرا اہم سائنسی اور فلسفیانہ نکتہ جس کا اظہار ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کیا یہ کائنات ایک علّت کے تحت وجود میں آئی ہیں؟ (۲) اور اگر یہ علّت کے تحت وجود میں آئی تو اس علّت کی ماہیت کیا ہے؟ عالم کبیر یا عالم صغیر میں ہر واقعہ یا حادثہ کے لئے ایک علّت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کائنات کی علّت کو سمجھنے کے لئے ایک دشواری جو درپیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتداء زماں' مکاں' مادّہ ایک نقطہ کی شکل میں ہوئی۔ اس سے پہلے یا کب اور کہاں کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ زماں و مکاں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس لحاظ سے کائنات کی علّت مادّی یا زمانی و مکانی نہیں ہو سکتی۔ کائنات کی ابتداء صفر وقت اور صفر قطر والے نقطہ سے شروع ہوئی جو لاشئے ہے۔ لیکن لاشئے سے شئے کیسے وجود میں آسکتی ہے اس سے ہمیں ایک ایسی علّت کی ضرورت ہوتی ہے جس کا اقتدار لامتناہی ہو اور جو لاشئے سے شئے کو تخلیق کر سکتا ہو۔ اس چار ابعادی زماں و مکاں کی کائنات کو ہم حادثہ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی پچھلی طبعی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ زماں و مکاں کو اس نقطہ صفر سے پیچھے نہیں لے جایا جا سکتا (۳)

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کائنات کا نقطۂ اول Heizenburg کے نظریہ غیر یقینیت Uncertainty Principle کی ایک مثال ہے۔ نظریہ غیر یقینیت کا ادعا یہ ہے کہ ایک ذرے

کے کوئی دو خواص جیسے اُس کا محل وقوع اور اس کی توانائی کا تخمینہ ہم ایک ساتھ بیک وقت نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارے مشاہدات کے نقص یا کوتاہی کا نتیجہ نہیں' بلکہ نظام قدرت کا ایک قانون ہے۔ اگر محل وقوع کا تعین ہو گیا تو توانائی غیر یقینی یا امکانی ہو گی۔ نظریہ غیر یقینیت کا اطلاق ذرات کے خواص سے ہے۔ یہ اس کی ابتداء کے لئے نہیں ہے۔ اگر ہم کائنات کی ابتداء کو غیر یقینی مانیں تو پھر اس کی توانائی کا مبداء کیا ہے؟ وہ توانائی جو اربوں آفتابوں کی تمازت کے برابر تھی۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ کائنات کی خلقت سے پہلے کوئی خلا تھا تو یہ توانائی اگلے ارتعاش کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ آج کل کوانٹم نظریہ خلا کے حقیقی وجود کو غلط ثابت کر رہا ہے کیونکہ خلا میں یعنی مکاں میں مادّہ کے بغیر ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور پھر اس ارتعاش کے نتیجہ میں خیالی ذرات Virtual Particles خلا میں پیدا بھی ہوتے ہیں اور پھر خلا میں جذب بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ خیالی ذرات لاشئے سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ کائنات کی ابتداء سے پہلے ہم کسی خلا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خلا کا مطلب مکاں کا ہونا ہے۔ اس کائنات کی توانائی کا مبداء اس طرح زمانی و مکانی یا مادّی نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف پروردگار عالم کی قدرت کاملہ کا نتیجہ ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت سامنے آتی ہے کہ کائنات کی خلقت کے وقت یعنی Big Bang کے وقت طبعی قوانین کا اطلاق اس کوانٹم کف پر نہیں ہو سکتا جو زماں و مکاں اور مادّہ کی علحدگی کے وقت تھا۔ کیوں کہ طبعی قوانین زمانی و مکانی نہیں اس لئے ہم کسی بھی تخمینہ سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ حادثہ کے بعد یا Big Bang کے بعد کیا ہوا یہ بات انسان کی سمجھ سے باہر ہے کہ یہ حادثہ تباہ کن یا تخریبی کیوں نہیں ہوا بلکہ سارے اندازوں کے خلاف Big Bang ایک حادثہ ہے جس میں ایک منظم کائنات کی تخلیق عمل میں آ رہی ہے۔ ایسی کائنات جو چھ ادوار میں تشکیل پائی اور ہر دور میں مادّہ اور توانائی کے مختلف اشکال میں توازن تھا۔ ایسا توازن جو ایک ارب ویں حصہ سے بھی کم حصہ کی حد تک باریک Accurate تھا۔ مادّہ آپس میں مل کر لاکھوں کروڑوں ستاروں اور کہکشاؤں کی تخلیق کا باعث بنا۔ اور پھر ان ستاروں میں مادّہ اور توانائی کا ایسا تناسب اور ایسے موافق حالات کہ ان میں سے چند ستاروں میں زندگی کا کارواں آگے بڑھ سکے۔ ایک ایسی علّت کی نشاندہی کرتی ہے جو اس عظیم تنظیم کا مدبّر، مصوّر اور صاحب قدرت ہے۔ Stepher. Hawkins (4) نے اسے زمان و مکان کی آخری حد کہا ہے۔ یعنی edge of space & time اور بعض نے اسے بالاتر شعور super conscience کہا ہے۔ (5) اس علّت کو آپ چاہے جو بھی نام دیں اس کے وجود کے بغیر اس کائنات کی تخلیق ناممکن تھی۔ یہ کائنات ہمارے محدود علم کی بنا پر ناقابل قیاس unpredictable

ضرور ہے لیکن یہ بغیر علّت کے نہیں ہے۔اسی لئے تو اللہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے۔

"کیا یہ بغیر شئے کے پیدا ہوئے۔یا یہ اپنے آپ خالق ہیں"۔اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کا خالق ہے۔

مادّیین materialists کا اہم سوال یہ بھی ہے کہ کائنات ۱۴ارب سال پہلے جب پیدا ہوئی تھی تو اس سے پہلے یا اس کے بعد کیوں نہیں خلق ہوئی (۶) یہ سوال اُس وقت بامعنی ہوتا جبکہ کائنات کی تخلیق بغیر کسی علّت کے ہوتی۔ایسی صورت میں اس کی تخلیق جبری علّت determined cause سے نہیں ہوتی۔یہ کائنات ایک بے تکی random طریقہ سے نہیں بلکہ ایک منظم طریقہ سے ایک خاص وقت میں تخلیق ہوئی۔یہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ علّت کائنات ایک صاحبِ ارادہ اور مقتدر ہستی ہے جو کئی ممکنات میں سے صرف ایک وجود کو اپنے ارادہ سے خلق کرتی ہے۔امام غزالی (۷) نے مادّیین کے خلاف یہ نظریہ پیش کیا کوئی میکانیکی علّت' کائنات کو اپنے ارادہ سے پیدا نہیں کرسکتی کیوں کہ اس کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔کائنات جو ایک حادث اثر ہے۔ایک باارادہ خالق ہی سے ہی ممکن ہے۔ایک میکانیکی علّت حالات کے لحاظ سے اثر پیدا کرسکتی ہے اور نہیں بھی۔لیکن ایک صاحبِ اقتدار ہستی بغیر کسی وقت کے تعین کے اثر پیدا کرسکتی ہے۔اس لئے کائنات کی تخلیق ایک باارادہ فاعل مختار کا فعل ہوسکتا ہے۔

کوانٹم نظریہ کے لحاظ سے ممکنات کو وجود میں تبدیل کرنے ایک شاہد کی ضرورت ہوتی ہے (۸) خالق کائنات وہ صاحب مقتدر ذات ہے جس میں ممکنات اس کا امر ہیں۔وہ اپنے ارادہ اور حکم کُن فیکُون سے ایک ایسے عالم کی ابتدا کرتا ہے جو ایک نقطہ میں اس طرح سما جائے کہ مادّہ توانائی اور سارے طبعی قوانین اس میں آجائیں۔اسی طرح جس طرح ایک بیج میں پودے کی نشوونما کے سارے قوانین پوشیدہ ہوتے ہیں۔اشیاء کی خلقت کے ساتھ ساتھ اشیاء کے ناموں کی ابتداء ہوئی۔اور اللہ نے اپنے خلیفہ آدم علیہ السلام کو ان اسماء کی تعلیم دی۔ان کے ارادہ سے کارواں پیدا بھی ہورہے ہیں اور فنا بھی ہورہے ہیں۔

اگر ہم آئنسٹائن کے عام اضافیت کی مساوات کو حل کریں (۹) تو اُن میں ایسے نقاط کا پتہ چلتا ہے جو کائنات کی ابتداء سے مماثلت رکھتے ہیں جہاں مادّہ کی کمیت لامتناہی اور ثقل بھی لامتناہی ہوجاتا ہے۔ایسے اجسام، جب ستاروں کی روشنی ختم ہوجاتی ہے تو قوتِ ثقل کے اثر سے مادّہ کے سکڑنے سے پیدا ہوتے ہیں۔یہاں ان کی کثافت کئی ارب گنا ہوجاتی ہے اور حجم ایک گولہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ایسے اجسام کو Black hole کہتے ہیں۔اُن میں قوت ثقل اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ زمان ومکان کو اپنے اطراف لپیٹ لیتے ہیں اور اُن میں شگاف پیدا کرتے ہیں۔آئنسٹائن اور روزن Rosen کا حیرت

انگیز انکشاف یہ تھا کہ Black hole کا سوراخ زماں ومکان کا شگاف ہے۔ایک راہ داری ہے۔ یہ ایک راہ داری ہے جس سے گزر کر ہم اپنے مستقبل یا ماضی کی طرف جاسکتے ہیں۔ ہماری زندگی میں ماضی سے مستقبل کا جو سفر ہے وہ صرف ایک رخی ہے۔ ہم پیچھے ماضی کی طرف نہیں جاسکتے۔ یہ سفر world line کی شکل میں زماں ومکاں میں مرتسم ہوجاتا ہے۔ زماں ومکان کے انتہائی موڑ سے اور Black hole میں لپیٹ جانے سے یہ World line بھی مڑ کر اگلے دونوں سرے ایک دوسرے کو cross کرتے ہیں اس کی وجہ سے ہم ماضی کی طرف جاسکتے ہیں۔ چوں کہ عام طور پر چھوٹی مقدار میں ثقل کا اثر مکاں میں اتنا موڑ نہیں پیدا کرسکتا کہ ہم ماضی کی طرف جاسکیں۔ اس لئے ہمارا سفر زندگی ایک رُخی ہے۔ آج کل ایسی مشین کی دریافت کے متعلق کام ہورہا ہے جس کی مدد سے انسان اپنی ماضی کی طرف جاسکے۔ اس کو time machine کہتے ہیں اور یہ صرف اس Black hole کی راہ داری سے گزرنے پر ہی ممکن ہے۔ اس راہ داری میں گزرنے کے لئے مادّی ذرات ناموزوں ہوتے ہیں کیوں کہ مادّہ Black hole میں پوری طرح جذب ہوجاتا ہے۔ اس میں سے صرف خیالی ذروں کو ہی گزارا جاسکتا ہے۔ یہ خیالی ذرات ہمارا جسم نہیں ہوسکتا بلکہ ہماری روح ہوسکتی ہے جو اس راہ داری سے گزر کر کسی اور کائنات میں پہنچ جائے کیوں کہ اس راہ داری کی انتہا پر دوسری کائناتیں شروع ہوتی ہیں جن کے زماں ومکان کے ابعاد بالکل الگ اور جہاں کے کارواں بالکل الگ ہیں۔ راہ داری کے دہانے پر ایسی کئی کائناتیں ہیں۔ جس طرح ہماری کائنات سے دوسری کائنات میں جانا ناممکن ہے۔ اسی طرح سے ان کائناتوں سے ہماری کائنات میں آنا ناممکن ہے۔ انسان اور جن، جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے الگ الگ کائناتوں کے مسافر ہیں۔ لیکن نہ ہم ان کی کائنات میں جاسکتے ہیں اور نہ وہ ہمارے پاس۔ اس طرح ملائکہ کی کائنات بالکل الگ ہے اور ان کے کارواں بالکل الگ ہیں۔ یہ صرف اللہ کے حکم سے ہی ہماری کائنات میں آسکتے ہیں۔ بہرحال سائنسی انکشافات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہاں کئی کارواں اور بھی ہیں۔ جن کے حالات الگ، جن کی کائنات کے ابعاد الگ اور جہاں کی مخلوق بالکل الگ ہے۔ یہ قادر مطلق کا امر ہے کہ وہ جو چاہے جہاں چاہے خلق کرسکتا ہے۔

حوالہ جات:

(1) Rees Martin, Before the Beginning, our Universe and others, Persins books, Reading, Mass .(U.S.A) (1997)

(2) Craig.W.L and Smith Quentin;Theism, Atheism and Big Bang Cosmology; Oxford (1993)

(3) Hawkins. Stephen, Black Holes and the Baby Universe; Bantum Books N.Y.(1993)

(4) Hawkins Stephen, The Theory of Everything; New Milleniuim press, california (2002).

(5) John Gribbin, In Search of the Big Bang. Gorgi Books. N.Y.(1986)

(6) Frijoy.Capra; the Turning point, Harper Collins, N.Y. (1982)

(7) Iman Ghizali. Tahafat-ul- Filasafa; Osmania University (1942)

(8) Herbert Nick; Quantum Reality, Anchor Books, N.Y. (1985)

(9) Greene Brian, The Elegant Universe, Vintage Books, N.Y (2000).

○○○○○

# اقبال کو مخدومؔ کا خراجِ عقیدت

(اقبال کی زندگی میں حیدرآباد دکن میں نہایت تزک و احتشام سے ۹ رجنوری ۱۹۳۸ء یوم اقبال منایا گیا۔ اس جلسہ میں سربراہان حکومت کے علاوہ حیدرآباد کے ممتاز اکابرین علم نے حصہ لیا۔ اس موقع پر حیدرآباد کے مقبول شاعر جناب مخدوم محی الدین نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ مخدوم کے دوست محترم جناب سرینواس لاہوٹی نے خود شاعر کے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ نظم اکیڈیمی کو عنایت فرمائی تھی۔ یہ نظم مخدوم کے عکس تحریر کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ جناب مخدوم محی الدین نے ''مجاہد اقبال'' کے موضوع پر ایک مقالہ بھی پیش کیا تھا یہ نظم اور مقالہ کا اقتباس ''سب رس'' اقبال نمبر ۱۹۳۸ء مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو میں شایع ہوئے تھے۔ نظم اور مقالہ کا اقتباس بھی قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ ادارہ)

## اقبال

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا
جانب مشرق اُجالا سا نظر آنے لگا

موت[1] کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں چھٹنے لگیں
ظلمتوں کی چادریں ہٹنے لگیں ہٹنے لگیں

ایک شرارہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا
آسماں کے نور پیکر نوجوانوں تک گیا

عالمِ بالا پہ باہم مشورے ہونے لگے
آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے

پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا
زندگی کے موڑ پر گاتا ہوا پایا گیا

گیت سننے کے لئے خلق خدا آنے لگی
گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی

نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں
صورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

عرش کی قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

مخدومؔ محی الدین

---

(۱) مطبوعہ نظم کے دوسرے شعر کا پہلا لفظ ''موت'' ہے۔ لیکن مخدوم نے اپنی تحریر میں اسے ''ظلم'' لکھا ہے۔

## مخدوم کا عکس تحریر

[illegible]

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا
جانبِ مشرق اجالا سا نظر آنے لگا

ظلم کی چھاؤنیاں [illegible] لگیں [illegible] لگیں
ظلمتوں کی چادریں ہٹنے لگیں ہٹنے لگیں

اک شرارہ اڑتے اڑتے آسماں تک آ گیا
آسماں [illegible] نوجوانوں تک گیا

عالمِ بالا پہ [illegible] شور سے ہونے لگے
آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے

پھر اندھیرے میں رہی آتش نوا کی [illegible]
زندگی میں [illegible]

وہ نقیبِ زندگی تمام رات [illegible]
[illegible]

[illegible] خلقِ خدا [illegible]
[illegible] زمانے [illegible]

نغمۂ جبریل ہے [illegible]
صورِ اسرافیل ہے [illegible]

عشق کا [illegible]
[illegible] عشق کا [illegible]

مخدوم

مخدوم محی الدین

# مجاہد اقبال

## بال جبریل اور ضرب کلیم کی روشنی میں (اقتباس)

اقبال کے کلام کے کئی پہلو ہیں، اسی مناسبت سے اُن پر بحث کی جاتی ہے۔ ان ہی پہلوؤں میں سے ایک پہلو جہاد کا ہے اور غالباً غالب پہلو بھی یہی ہے۔ اقبال کے پیش نظر انفرادی اور اجتماعی سیرت کا ایک خاکہ ہے جس کسی کو وہ اپنے نصب العین سے ہٹا ہوا پاتا ہے اُس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ جس کسی کردار یا ارادہ میں اپنے خیال کی جھلک بھی دیکھتا ہے تو اُس سے متاثر ہوتا ہے مجاہد کی خود اقبال نے یہ تعریف کی ہے:

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بے گانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین وحق آگاہ
خاشاک کے تودے کو کہے دماوند

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند

پرسوز نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خرسند

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے کا غنچہ سے کوئی ذوقِ شکر قند

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

یہی ہے مجاہد کی تعریف، یہی بندۂ گستاخ کہیں اقبالؔ، کہیں مومن، کہیں قلندر، کہیں درویش اور کہیں مرد کامل کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے دنیا کی تاریخ میں یہ مرد مجاہد عہد کے سماجی حالات کے مطابق کبھی مصلح، کبھی مدبر، کبھی شاعر اور کبھی پیغمبر کے پیکروں میں نمودار ہوا ہے۔ اس کا کام کلیسا اور حرم کے چراغ گل کرنا ہے تاکہ خدا اور انسان میں کوئی پردہ حائل نہ رہے۔ اس کا کام میری و قیصری کے ایوانوں کو ڈھانا ہے تاکہ ابن آدم اس ارض اللہ پر نیابت الٰہی کا حقیقی

منصب ادا کرے۔ خونخواری نہیں بلکہ محبت کرنا سیکھے، وہ حق پرست اور باطل شکن ہے۔ اس کی بجلیاں اپنوں اور بیگانوں کا امتیاز نہیں کرتیں۔ وہ فرعون کے لئے موسیٰ اور لات وہبل کے لئے محمدؐ ہے لات وہبل چاہے حرم کے ہوں یا سومنات کے، عرب کے ہوں یا عجم کے۔ فرعون چاہے مشرق کے ہوں یا مغرب کے، مدرسہ کے ہوں یا خانقاہ کے۔

اقبال کے کلام کا مرکزی جذبہ عشق ہے۔ اس کی ساری تعلیمات اس کے سارے شاعرانہ تخیلات اسی جذبے کا طواف کرتے ہیں وہ عشق ہی کے بازوؤں پر بیٹھ کر آسمانوں کی سیر کرتا ہے فضا میں اڑنا اس کا محبوب مشغلہ ہے، گنبد نیلوفری میں اپنا نشیمن بنانا چاہتا ہے، اس کے کلام کے ہر ورق سے عالم بالا کی بو آتی ہے، مگر چوں کہ فلسفیانہ تجسس کا نقطۂ پرواز دنیاوی حقائق ہی میں ہے اس لئے آسمانوں کی سیر میں بھی اقبال کا دامن زمین ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے وہ نیند میں بھی زندگی کو نہیں بھولتا۔ ہر چند وہ عملی دنیا کی کشمکش سے منہ چھپا کر داخلیت میں بند ہو جاتا چاہتا ہے۔ باوجود خاکی ہونے کے خاک سے پیوند نہیں رکھنا چاہتا۔ مگر اس کی ذات میں صرف عشق ہی نہیں اس میں عقل کا عنصر بھی شامل ہے اور بامِ حرم کا یہ کبوتر زندگی اور اس کی تلخیوں کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انسان کے پیش نظر جب کوئی مقصد ہوتا ہے تو وہ اپنی آواز سے بولتا ہے۔ مگر جب کوئی مقصد نہیں ہوتا تو وہ گایا کرتا ہے۔ جب کچھ نہیں ہوتا تو وہ مصوری کرتا ہے۔ انسان کی جب کوئی منزل ہوتی ہے تو وہ اپنے پاؤں سے چلتا ہے جب کچھ نہیں ہوتا تو وہ رقص کرتا ہے۔ اقبال کی زندگی کا سارا جہاد اسی دنیا کے لئے ہے۔ اسی سرمدی دنیا میں وہ گانا، مصوری کرنا اور رقص کرنا چاہتا ہے۔

خویشتن راوانمودن زندگی است　　ضرب خودراوانمودن زندگی است

(ماخوذ از ''سب رس''۔ اقبال نمبر جون ۱۹۳۸ء مطبوعہ ادارہ ادبیاتِ اُردو، حیدرآباد دکن۔)

ooo

# اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیاں

## ا۔اجتماعات

ا۔۲۸/ڈسمبر۲۰۰۲ء۔توسیعی تقریر:
مقرر: مولانا رضوان القاسی۔موضوع: اقبال کا تاریخی شعور
صدارت: پروفیسر سید سراج الدین، صدر اکیڈیمی
۲۔اا/جنوری ۲۰۰۳ء جلسہ تعزیت بہ یاد جناب سید محمد مصلح الدین سعدی (اس جلسہ کی رودادا قبال ریویو اپریل ۲۰۰۳ء ''اقبالیات سعدی'' میں شائع ہو چکی ہے۔
۳۔۲۵/جنوری ۲۰۰۳ء۔محفل اقبال
مقالہ نگار: ا۔جناب عابد محی الدین۔موضوع: ''آئینہ ایام آج اپنی ادا دیکھ''
۲۔جناب عبدالمقیت۔موضوع: بانگِ درا کی نظم 'چاند اور تارے''
۳۔پروفیسر عقیل ہاشمی۔موضوع: 'اقبال اور حکمتِ قرآنی''
صدارت: جناب محمد ظہیر الدین، نائب صدر
۴۔۲۹/اپریل ۲۰۰۳ء توسیعی تقریر
موضوع: ''دورِ جدید کا بحران (Crisis) اور اسلامی حکمت عملی''
مقرر: ڈاکٹر رحیم الدین کمال
صدارت: پروفیسر سید سراج الدین
۵۔۳/مئی ۲۰۰۳ء خصوصی محفل 'نذرِ انا ماری شمل''
مقررین: محمد ظہیر الدین صاحب، پروفیسر یوسف کمال، جناب مضطر مجاز، ڈاکٹر یوسف اعظمی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب (تاثرات ذریعہ ای میل)
صدارت: پروفیسر سید سراج الدین
۶۔۲۸/جون ۲۰۰۳ء محفل اقبال (تجزیاتی مطالعے)
مقالہ نگار: ا۔جناب محمد ظہیر الدین
موضوع: بال جبریل کی نظم ''عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں''۔ایک تجزیہ

۲۔ جناب طالب خوندیری: موضوع: ''ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں''
صدارت: پروفیسر سید سراج الدین
۷۔ ۱۶/اگست ۲۰۰۳ء محفل اقبال (تجزیاتی مطالعے)
مقالہ نگار: ۱۔ جناب مضطر مجاز۔ موضوع: ''پیام شرق کی نظم شبنم''
۲۔ پروفیسر یوسف کمال۔ موضوع: بانگ درا کی نظم ''محبت''
صدارت: پروفیسر سید سراج الدین۔

## ۲۔ کتب خانہ

الحمدللہ اقبال اکیڈیمی کے کتب خانے میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ اکیڈیمی کے کئی ہمدردان نے بطور تحفہ کئی کتابیں عنایت کی ہیں۔ کتابوں کی فہرست، فن واری، ترتیب کے اعتبار سے کمپیوٹر پر ترتیب دی جارہی ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ ہندوستان میں اقبالیات پر کتب اور رسائل کا اتنا بڑا ذخیرہ کہیں اور موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی تفاسیر، تراجم (مختلف زبانوں میں)، احادیث شریف، سیرت طیبہ، تاریخ اسلام، تصوف وسلوک، فقہ اسلامی، اسلامیات کے مختلف موضوعات کے علاوہ اسلام اور سائنس، مذاہب کے تقابلی مطالعے، جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کا حصہ وغیرہ پر علٰحدہ شعبے بھی قائم کئے گئے ہیں، اہم شخصیات جیسے، مولانا مودودی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، سرسید، غالب، ابوالکلام آزاد وغیرہ کی تصانیف اور ان پر تصانیف یکجا رکھی گئی ہیں اس کے علاوہ دیگر، فنون پر کتابیں موجود ہیں۔ خصوصی جراید کا ایک علٰحدہ شعبہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ اسکالرس اور طلباء اس کتب خانے سے استفادہ کررہے ہیں، کتب خانہ کے ہال میں ہی مطالعہ کے لئے سہولت فراہم کی گئی ہے۔ کتب خانے کے ساتھ ایک دارالمطالعہ بھی کام کررہا ہے۔ کرم خوردہ کتابوں کو مزید خرابی سے محفوظ رکھنے کے لئے Fumigation Chamber فراہم کیا گیا ہے۔ بعض کتابوں اور رسائل نہایت قدیم اور خستہ حالات میں ہیں جن کی جلد بندی اور حفاظت کے لئے کثیر سرمایہ درکار ہے اور ایک مستقل لابریرین کی بھی شدید ضرورت ہے۔ مالی وسائل کی فراہمی پر ان ضروریات کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

۳۔اقبال ریویو:

اکیڈیمی کا ترجمان شش ماہی اقبال ریویو پابندی کے ساتھ شایع ہو رہا ہے۔

۴۔کتابوں کی اشاعت:

اکیڈیمی نے اب تک (۲۳) کتابیں شایع کی ہیں۔(اُن میں سے بعض کتابیں اب دستیاب نہیں ہیں۔) حالیہ مطبوعات میں پروفیسر غلام دستگیر رشید کی کتاب اقبال کی نعتیہ شاعری اور پروفیسر تقی خاں کی کتاب ''اقبال کا سائنسی منہاج فکر'' شامل ہیں۔

۵۔تنظیمی امور:

جناب محمد ضیاء الدین نیئر کی بہ حیثیت معتمد نامزدگی

پروفیسر سید سراج الدین نے ذریعہ مکتاب مورخہ ۱۲ر مئی ۲۰۰۳ء جناب محمد ضیاء الدین نیئر کو بہ حیثیت معتمد اقبال اکیڈیمی نامزد کیا ہے۔اور اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ اکیڈیمی کی ساعی کی توسیع اور استحکام میں انشاء اللہ ان کی خدمات نمایاں رہیں گی جناب سید امتیاز الدین شریک معتمدؔ اقبال ریویو کے مدیر اور اجتماعات کے ناظم رہیں گے۔

○○○○○

# گوشهٔ اناماری شمل

It is a very great pleasure to visit the Iqbal Academy Hyderabad! I must confess that I am deeply impressed by the activities of this body and by the enthusiasm and true scholarship I find among its members. You can be assured that I shall tell about the Academy wherever I go to celebrate Iqbal, and I shall try to send you may works on Iqbal as soon as possible.

Thank you most cordially for the warm welcome you have accorded me in a true blending of علم و عشق, and I do hope that we'll meet again before long!

مع اخلاص تمام

Annemarie Schimmel

Harvard University

Nov. 3, 1979

"It is a very great pleasure to visit the Iqbal Academy, Hyderabad. I must confess that I am deeply impressed by the activities of this body and by the enthusiasm and true scholarship I find among its members. You can be assured that I shall tell about the academy wherever I go to celebrate Iqbal and I shall try to send you my works on Iqbal as soon as possible.

Thank you most cordially for the warm welcome you have accorded me in true blending of *Ilm-o-Ishq* and I do hope that we'll meet again before long."

مع اخلاص تمام

Nov. 3, 1979

Annemarie Schimmel

Harvard University

"It is almost a year that I came here first, and on my second visit to Hyderabad I am delighted to see once more the devoted work of my Hyderabadi friends for the propogation of Iqbal's ideas.

The discussion after my lecture proved that the living interest in Iqbal is very strong and thought-provoking, and I hope that I will have the opportunity of coming here again.

Besides, I always ly on the excellent arrangements for the lectures, the warm, heartfelt reception and the loving preparation made in order to make the visitor happy!

With every good future for continuing success

26. X 1980

Annemarie Schimmel

پروفیسر سید سراج الدین

# انا ماری شمل کی یاد میں

ڈاکٹر انا ماری شمل جہاں گرد تھیں، کہاں کہاں وہ نہیں گئیں، ہالینڈ، سویٹزرلینڈ، سویڈن، ترکی، مصر، ایران، افغانستان، پاکستان، ہندوستان، ترکستان، انگلستان، امریکہ اور بھی ملک شاید ہوں گے۔ لیکن آج سے بائیس تیئیس سال پہلے کسے خیال تھا کہ ان کے قدم سرزمینِ دکن اور شہر حیدرآباد پہنچیں گے۔ ان کا سلسلہ حیدرآباد سے کچھ تھا ضرور۔ وہ عالم خوندمیری مرحوم کے پی ایچ ڈی مقالے کی نگران تھیں اور غالباً ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب سے ان کی راہ ورسم تھی۔ بہر حال کسی نے میکس مولر بھون سے کہا کہ انھیں بلایا جائے اور وہ ۱۹۷۹ء میں پہلی دفعہ حیدرآباد آئیں اور جیسا کہ ان کا دستور تھا ہر پرانے، تاریخی شہر سے انھیں محبت ہو جاتی تھی، وہی حیدرآباد کے ساتھ ہوا۔ ۷۹ء میں عالم زندہ تھے اور اقبال اکیڈیمی میں جو لکچر شمل کا ہوا اس کی صدارت انھوں نے ہی کی تھی۔ باقی چار بار اعزاز مجھے نصیب ہوا۔ مجھے اپنی زندگی میں تین چار مشاہیر سے واقفیت اور قربت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان میں آنا مری شمل سب سے زیادہ مشہور عالم تھیں۔ یہ سب اونچے ذہن کے لوگ تھے اور ان سے اپنی قربت جس میں ان کی محبت شامل تھی، کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایک reflected glory کا احساس ہوتا ہے غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے:

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب سے پروفیسر شمل کا خصوصی تعلق تھا۔ وہ انھیں اپنا خلیفہ لکھتی تھی اور خود کو ''الفقیرۃ الی رحمتہ ربی''۔ ان میں واقعی ایک فقیری تھی۔ فقر اسلام کی بہت بڑی قدر رہا ہے ع ''سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں'' انا ماری شمل نے میرے ساتھ بڑی یگانگت اور محبت کا سلوک کیا۔ کچھ کتابیں مجھے تحفہ دیں۔ جب وہ پہلی دفعہ حیدرآباد آئیں تو اقبال اکیڈمی میں ان

کے لکچر کے بعد ایک نشست میکس مولر کے گسٹ ہاوز میں جو ہمایوں نگر مین پہاڑ پر واقع ایک بہت خوبصورت مکان میں کرائے پر تھا، رکھی گئی تھی۔ وہاں میں اپنے ساتھ امّ حبیبہ کا ایک کیسٹ لے گیا تھا۔ اس کیسٹ میں ام حبیبہ نے جامی کی نعت ''بلبل زِتو آموختہ شیریں سخنی را''، بغیر ساز کے اس قدر دلکش آواز میں گائی ہے کہ جس کی داد دینی مشکل ہے۔ شمل نے اس کیسٹ کو بار بار سنا اور وجد کرتی رہیں۔ ان کی اس ادا نے اس شام کو یادگار بنا دیا۔ میں نے ان کو آخری بار دسمبر ۹۷ء میں لندن میں دیکھا۔ وہاں ان کو وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزم میں ایک لکچر دینا تھا۔ غالباً چھ یا سات بجے شام۔ لکچر سے پہلے انھوں نے مجھے۔ اور ڈاکٹر شکیب کو ایک رسٹورنٹ پر کھانا کھلایا۔ ٹھیک وقت پر ایک مختصر سے رسمی تعارف کے بعد مائیک کے سامنے جا کھڑی ہوئیں، آنکھیں بند کرلیں جس کے معنی یہ تھے کہ لکچر شروع ہوگیا۔ ٹھیک ایک گھنٹہ بعد انھوں نے آنکھیں کھول دیں جس کے معنی یہ تھے کہ لکچر ختم ہوگیا۔ صرف میں نے بلکہ کسی نے بھی ایسی تقریر نہیں سنی ہوگی جو آنکھیں بند کر کے دی جائے اور اس میں نہ کہیں کوئی جھول ہو نہ پس و پیش۔ جولائی ۹۹ء میں شمل لندن آئی تھیں۔ اس وقت میں بھی وہیں تھا۔ شکیب صاحب کے ہاں ادیبوں اور عالموں کی محفل تھی جس میں میں بھی مدعو تھا۔ لیکن یہ ایسے روز تھی کہ دوسرے دن صبح مجھے امریکہ جانا تھا۔ میری فلائٹ صبح ۶ بجے تھی اور ۳ بجے مجھے گھر سے نکلنا تھا۔ شکب صاحب کی محفلیں بارہ ایک بجے سے پہلے ختم نہیں ہوتیں، اس لیے میں نے معذرت کر لی۔ میرے نہ ہونے سے اس محفل میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن شمل نے فون کیا اور کہا کہ تمہاری کمی بہت محسوس ہو رہی ہے۔ اتنے محبت بھرے لہجے میں بات کی کہ میں بھول نہیں سکتا۔

شمل نے اپنا امریکن کونسل آف لرینڈ سوسائٹیز کا ہیسکنز Haskins لکچر صیغۂ واحد غائب میں شروع کیا ہے۔ (۱۹۹۳ء) کسی زمانے میں وسطی جرمنی کے ایک خوبصورت شہر ایرفُرٹ Erefurt میں ایک چھوٹی سی لڑکی رہتی تھی۔ Once upon a time کہہ کر انھوں نے اپنے بچپن کو ایک افسانوی رنگ دے دیا ہے۔ ایرفرٹ گوتھک گرجاؤں کا شہر ہے۔ یہیں لوتھر نے رہبانیت کا عہد کیا تھا، دورِ وسطیٰ کے ایک مشہور عارف مائسٹر ایکہارٹ Meister Echart نے

یہیں اپنے وعظ دیئے تھے اور یہیں گوئیٹے نے نپولین سے ملاقات کی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انا مری جیسی لڑکی کی پیدائش (۱۹۲۲ء) کے لیے یہ شہر موزوں تھا۔ اس کی قدامت پسند فضا میں ایک مذہبی رنگ تھا۔ بچپن میں شمل کو چرچ کی عبادات اور رسموں میں بڑا لطف آتا تھا۔ چرچ کے علاوہ شمل کی دلچسپی پریوں کی کہانیوں اور شعر وشاعری سے تھی۔ ایک کہانی ''پدمنابھا اور حسن'' انھیں بے حد پسند تھی۔ اس میں ایک ہندو ودوان ایک عرب کو گیان کے گُر اور بھید بتاتا ہے۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہر طبع مذہب کے لیے موزوں نہیں ہوتی بالکل جس طرح ہر طبع سائنس یا ریاضی کے لیے موزوں نہیں۔ ویسے عبادات تو جو شخص چاہے ادا کر لے لیکن وہ مذہبیت جو انسان کی شخصیت کو گھیر لے اور اس ایک احساس ماورائیت اور سرّی بصیرت بخشے ہر ایک کے بس کی نہیں۔ شمل میں ''یہاں تو طبع کی افتاد میں ہے ذوق سجود'' والی بات تھی۔ وہ بالطبع صوفی منش تھیں۔

اسکول میں شمل کی اصل دلچسپی زبانوں سے تھی، فرانسیسی اور لاطینی سے۔ بعد میں کہتے ہیں انھوں نے بارہ زبانوں کی تحصیل کی جن میں یوروپ کی کئی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، سندھی، اردو، تاجکی، ازبکی، پنجابی شامل ہیں۔ مذکورہ زبانوں میں ان کو سب سے زیادہ عبور، ترکی، سندھی اور عربی پر تھا۔ پھر فارسی اور اردو پر۔ برلن یونیورسٹی سے انھوں نے ۱۹۴۱ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ یہ عین جنگ کا زمانہ تھا اور نازیت پورے جرمنی پر طاری تھی۔ یونیورسٹیوں میں بھی یہی قصہ تھا۔ اسی نازیت کے مرکز برلن میں ایسے بھی لوگ تھے جن کا تعلق میکس مولر، روکرٹ Ruckert اور گوئیٹے کی روایت سے تھا۔ ان لوگوں میں آہستہ آہستہ انا مری شمل سب سے زیادہ سربرآوردہ ثابت ہوئیں۔ مشرق کی روایات اور تہذیب سے شمل کو فطری لگاؤ تھا۔ چناں چہ پندرہ سال کی عمر میں انھوں عربی سیکھنی شروع کی۔ اس مشرقی شوق کی ابتدائی محرک فریڈرش روکرٹ کی شاعری تھی۔ روکرٹ نے کئی مشرقی شاہکاروں کے جرمن میں بڑے شاندار ترجمے کیے تھے۔ برلن میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کے دوران شمل نے اسلامک آرٹ کے کورس بھی کیے۔ یہیں یونیورسٹی کی خاتون پروفیسر آنا مری فان گابین Gabain نے انھیں ترکیات Turcology سے متعارف کیا شمل اس پروفیسر کو اپنی بہن، اپنی آپا، لکھتی ہیں۔

برلن سے ۴۶ء میں پرشمل ماربرگ چلی آئیں جہاں انھیں عربی اور اسلامیات کی پروفیسری کا عہدہ دیا گیا۔ یہاں انھوں نے اپنا افتتاحی ایڈرس دیا تو اسے بہت پسند کیا گیا لیکن جب انھوں نے ماربرگ جیسے قدامت پسند شہر کی یونی ورسٹی میں اپنا خطبہ ختم کیا تو فیکلٹی کی واحد خاتون پروفیسر لوایزے برٹ ہولڈ Luise Berthold نے اُن سے جو کہا اس سے اندازہ ہوتا ہے اس زمانے کی جرمنی کے معاشرے میں عورت کا کیا مقام تھا۔ شمل نے برٹ ہولڈ کے الفاظ نقل کر دیے ہیں جو یہ ہیں:

My dear child remember one thing men are our enemies بہت

بعد میں جب شمل کو اندازہ ہوا کہ ماربرگ میں بحیثیت عورت کے ان کی ترقی کی ایک حد مقرر ہے تو انھیں لویزے کی بات یاد آئی۔

۱۹۵۰ء میں شمل انٹرنیشنل کانفرنس فار ہسٹری آف ریلیجن میں شرکت کے لیے ایمسٹرڈم گئیں جہاں اس موضوع کے دیوقامت علما جمع تھے۔ انھیں میں فرانس کے میسینان تھے جو شمل کو نور ہی نور لگے۔ انھیں دیکھ کر جسم کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

۱۹۵۲ء میں شمل ترکی کے کتب خانوں میں اسلامی مخطوطات کے مطالعے کے لیے استامبول گئیں اور پہلی ہی نظر میں اس شہر کی گلی کوچوں اور یہاں کے لوگوں کی مروّت و مہمان نوازی نے ان کا دل موہ لیا۔ لوگوں سے گفتگو میں انھیں ترکی کے کلاسکی، ماضی کا علم ہوا۔ پھر اسی موقع پر وہ قونیہ گئیں جہاں صوفی شعرا کے سرخیل مولانائے روم (وفات ۱۲۷۳) اور جو شمل کے محبوب شاعر ہی نہیں قریب قریب ان کے مرشد کا درجہ رکھتے ہیں۔ شمل نے لکھا ہے کہ اب قونیہ میں اونچی اونچی اپارٹمنٹ عمارتیں بن گئیں جنھوں نے روحانیت کو گویا شہر بدر کر دیا ہے لیکن جب ۵۲ء میں وہ وہاں گئیں تو اس کی فضا ہی الگ تھی۔ اپنے پہلے تجربے کو انھیں کے الفاظ میں سنیئے:

" A thunderstorm at night transforned the greyish streets and a veritable paradise, the roads were filled with the heavy fragrance of iqde(Musk willow), and ı understood why Rumi's Poetry is Permeated with spring songs."

ترکی کا یہ دورہ شمل کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ یہاں انھوں نے شاعروں اور دانشوروں سے ملاقاتیں کیں اور انھیں ترکی کے مسائل کا پتہ چلا ایسے لوگوں کے مسائل جنھوں نے اپنا مقدس ورثہ، عربی رسم خط کھودیا تھا اور اب اس شکنجے سے نکلنے کی کوشش کررہے تھے۔ استامبول میں شمل کی ملاقات سمیہا آئی وردی Ayverdi سے ہوئی جو ترکی کی بڑی شاندار شخصیت مانی جاتی تھیں۔ ان کی صحبت میں شمل عثمانی کو ترکوں کے کلچر اور اسلامی فنونِ لطیفہ کے لافانی حسن کا اندازہ ہوا۔

ترکی سے لوٹیں تو شمل کو جرمنی بڑا سرد مہر لگا۔ ماربرگ میں ان کو پتہ چلا کہ ان کی دوست نے جو بات مردوں کے بارے میں کہی تھی صحیح ہی تھی۔ ماربرگ کو گوارا نہ تھا کہ ایک عورت اور وہ بھی ایسی عورت جو نہ صرف جوان تھی بلکہ جس نے مشرقی شاعری کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا تھا اسی طرز میں خود اپنی نظمیں لکھی تھیں اور جو، لاحول ولا، اسلام اور اس کی صوفی روایات کی اس قدر گرویدہ تھی ان کے درمیان رہے۔ لہٰذا جب انقرہ یونیورسٹی نے ان کو اسلامی دینیات کے نئے شعبے میں تاریخ مذاہب کا درس دینے کی دعوت دی تو انھوں نے فوراً اسے قبول کیا۔ ان کو اپنے لکچر ترکی زبان میں دینے تھے جس میں انھیں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ ترکی کا نیا رخ یعنی وہ معاشرت جو اتاترک نے اس کے لیے پسند کی تھی شمل کو نہیں بھائی۔ اس اتاترکیت کا نتیجہ صرف ایک سستی امریکیت تھی جسے نئے ترک اپنی اسلامی اور قومی جڑوں کو ترک کرکے اختیار کررہے تھے اور جس کے ردعمل کے طور پر ایک کٹر ملائیت پیدا ہورہی تھی جسے Fundamentalism کہنے لگے ہیں۔ دونوں صورتیں بڑی ناپسندیدہ تھیں۔ بہرحال اگلے پانچ سال شمل نے ترکی میں گزارے۔ وہ لکھتی ہیں کہ یہ پانچ سال ان کی زندگی کا بڑا نشاط انگیز دور تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ترکی شمل کے شعور میں ایک مرکزی مقام رکھتا ہے۔ یہاں انھوں نے کئی بار قونیہ کا دورہ کیا اور دسمبر ۱۹۵۴ء میں وہاں وہ مشہور ''زہے تقویٰ کہ من باجُبہ دوستاری رقصم'' والا درویشوں کا رقص دیکھا جس کو مصطفیٰ کمال نے ۱۹۲۵ء میں ممنوع کردیا تھا۔ یہ رقص جسے ترکی میں سماک Samac کہتے ہیں اب محض ایک سیاحتی تماشا بن کر رہ گیا ہے۔

ان پانچ سالوں کے ختم پر شمل ماربرگ لوٹ آئیں اور جب وہ یہ سوچ رہی تھیں آگے کہاں جانا ہے تو ان کے لیے ایک نئی راہ کھلی۔ یہ علامہ اقبال کی شاعری تھی جس کے کلام میں شمل کے مطابق مشرق ومغرب، رومی اور گوریٹے یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ نیا راستہ ان کو اس وقت ملا جب جرمن فلسفی روڈالف پان وتس سے ملاقات ہوئی۔ عرصہ پہلے پان وتس نے اقبال کو بعض نظموں کا ترجمہ جرمن میں کیا تھا۔ اس کے تشکر میں اقبال نے اپنی دو کتابیں پان وتس کو تحفتہً دی تھیں لیکن چوں کہ پان وتس کو فارسی بہتر نہیں آتی تھی کسی نے یہ دو کتابیں شمل کے حوالے کیں۔ یہ تھیں، پیام مشرق اور جاوید نامہ۔ جاوید نامہ کا شمل نے جرمن میں منظوم ترجمہ کیا اور پھر ترکی کے دوستوں کے اصرار پر ترکی نثر میں اس کا ترجمہ تبصرے کے ساتھ شائع کیا۔ اس طرح شمل کے لیے پاکستان کا راستہ کھلا۔ ترکی کے بعد پاکستان شمل کے کام اور دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ انھوں نے اِس ملک کے کوئی تیس دورے کیے، کونے کونے گئیں، یہاں کی تہذیب اور سیاست کو دیکھا او اقبال اور اسلام پر بے شمار لکچر دیے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ وہ سندھی زبان اور سندھ کی صوفی بھکتی روایت کی گرویدہ ہو گئیں جس کے سب سے بڑے نمائندہ شاہ عبداللطیف بھٹائی ہیں۔ سندھ کی بے شمار چھوٹی چھوٹی درگاہوں پر انھوں نے حاضری دی اور یہاں کی روحانی روایت اور فضا کو پوری طرح جذب کیا۔ عجیب لگتا ہے کہ شمل نے سندھ کی دڑیرہ تہذیب اور اسکے جبر کا تذکرہ بالکل نہیں کیا ہے، کم از کم زیر نظر لکچر میں نہیں کیا ہے۔ ان کی روش کچھ وہ لگتی ہے جو جگر نے اس شعر میں بیان کی ہے:

ان کا جو کام ہے ارباب سیاست جانیں　　میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

پاکستان میں شمل لکھتی ہیں وہ اپنے آپ کو بالکل اپنے وطن میں محسوس کرتی تھیں۔ پاکستان نے بھی ان کی بہت قدر کی، ان کو ''ہلال پاکستان'' کا سب سے بڑا غیر فوجی اعزاز دیا اور ان کی یادگار مہمان نوازی کی۔ پاکستان ہی نہیں شمل کو پورا برِ صغیر عزیز تھا۔ جب بھی وہ حیدر آباد آئیں انھوں نے اورنگ آباد، گلبرگہ، بیدر اور بیجاپور کا دورہ کیا۔ بیجاپور پر انھوں نے ایک یادگار سلائیڈ لکچر دیا تھا جو حیدر آباد میں لوگوں کو اب تک یاد ہے۔

بون میں وہ پروفیسر تھیں ہی، ہارورڈ آنے کی تحریک پہلے پہل کینٹویل اسمتھ نے دی۔ جسے بڑے پس و پیش کے بعد شمل نے قبول کرلیا اور ۱۹۶۷ء میں ہارورڈ میں شمل کی دو مشکلیں تھیں ۔۔ ایک اس زبان کی جس میں انھیں لکچر دینے تھے۔ ترکی میں وہ بڑے اعتماد سے لکچر دے سکتی تھیں لیکن انگریزی پر ان کی قدرت کچی پکی تھی۔ اسکول میں وہ صرف انگریزی ہی میں فیل ہو چکی تھیں۔ دوسرے جہاں جرمن میں مشرقی شاعری کے بڑے شاندار ترجمے موجود تھے، انگریزی میں وہ دستیاب نہیں تھے۔ ہاروڈ پہنچنے سے پہلے شمل ایران سے افغانستان ہوتی ہوئی برصغیر پہنچیں جہاں انھوں نے کثرت سے اردو اور فارسی کتابیں خریدیں۔ ہارورڈ کتب خانے میں اردو کتابیں برائے نام تھیں، شمل نے اتنی کتابیں جمع کیں کہ اب وہ اردو اور سندھی کے اعلیٰ ترین، کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ جب پہلے پہل شمل ہارورڈ پہنچیں تو اُن کے شریکِ کار نے اُن سے کہا تھا کہ ہاروڈ ایسی جگہ ہے جہاں آدمی بڑا تنہا ہو جاتا ہے۔ لیکن شمل کے شاگردوں نے جو زیادہ تر ہندوپاک، ایران، عرب یا امریکہ کے مغربی ساحل کے تھے ان کو عزت و محبت دی اور انھیں تنہائی کا احساس ہونے نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ شمل ہارورڈ کی علمی سوسائٹی میں مقبول ہوتی گئیں، امریکن کونسل آف لرنیڈ سوسائٹیز میں کئی لکچر دیے اور ایک اہم انسائکلو پیڈیا آف رلیجن کے ایڈیٹروں میں ان کا انتخاب ہوا۔

اپنے اس معرکتہ الآرا لکچر میں جس سے میں نے اپنی تقریر کا مواد لیا ہے، شمل نے ہارورڈ اور امریکہ کا اتنا ذکر نہیں کیا ہے جتنا افغانستان کے کوہ و صحرا، استامبول، انقرہ اور اناطولیہ کے مناظر، لاہور، اسلام آباد اور کراچی کے شہروں، سندھ کے ریگ زار میں جابجا نمودار اولیا کے مزاروں اور رومی، اقبال اور حلاج کی بات کی ہے۔ پدمنابھ اور حسن کا قصہ انھیں برابر یاد رہا ہے۔ ہلال پاکستان کے علاوہ شمل کو مصر کا آرڈر آف میرٹ کا تمغہ ملا جسے وہ وہ اپنا اولمپک مڈل کہتی تھیں۔ اور بھی کئی اعزاز ملے لیکن اپنی ساری شہرت اور علمیت کے باوجود ان کو اپنے عورت ہونے اور اسلام سے ایسی والہانہ دلچسپی رکھنے کی قیمت چکانی پڑی۔

اکتوبر ۱۹۹۵ء میں جب جرمن بک ٹریڈ ایسوسی ایشن نے انھیں اپنا بہت ہی باوزن اور

قیمتی انعام (جرمن کا نوبل انعام) دینا چاہا تو ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی سخت مخالفت اس کی ہوئی کہ فیڈرل ریپبلک آف جرمنی کے پریسڈنٹ ہر رومان ہیرتساگ Herr Roman Herzog نے اپنے افتتاحی خطبے میں اسے Fierce Controversy کا نام دیا ہے۔ سیکڑوں جرمن مصنفوں اور ناشروں نے بک ٹریڈ اسوسی ایشن پر اعتراض کیا۔ روزنامہ ہندو کی رپورٹ کے مطابق پانچ سو جرمن دانشوروں نے ایک دستخطی عرضداشت اس انعام کے خلاف پیش کی۔ ان لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ شمل نے ایران کی کٹر ملائیت، خصوصاً ۱۹۸۹ء کے سلمان رشدی کے خلاف خمینی کے فتوے کی ایسی شدید مذمت نہیں کی جیسی دوسرے دانشوران مغرب نے کی تھی۔ انھوں نے رشدی کے خلاف holy wars کو تو رد کیا لیکن مئی ۸۹ء کے ایک انٹرویو میں یہ بھی کہا تھا کہ:

''میں سمجھتی ہوں کہ کوئی مصنف اگر شعوری طور پر پیغمبر اسلام کی توہین کرتا ہے۔ اور رشدی صاحب جانتے ہیں کہ عالم اسلام میں (حضرت) محمدؐ کو کس عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ تو وہ بے حرمتی Sacrilege کا مرتکب ہوتا ہے''۔

بک ٹریڈ اسوسی ایشن کا امن انعام قبول کرتے ہوئے جو تقریر شمل نے کی اس میں انھوں نے کہا ہے کہ جو مہم میرے خلاف اس زور شور سے چلائی گئی اور جس میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو مجھے جانتے تک نہیں، اس نے مجھے بڑا گہرا دکھ پہنچایا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا ساری عمر کا کام جس کا مقصد مشرق ومغرب کو ایک دوسرے کے قریب لانا رہا ہے۔ اکارت ہو گیا۔ میں صرف یہ امید کر سکتی ہوں کہ وہ لوگ جنھوں نے میری مخالفت کی ہے انھیں ایسے عذاب سے کبھی گزرنا نہ پڑے جس سے میں گذری ہوں۔ میں نے اس تباہ کن فتوے پر ہمیشہ لعنت بھیجی اور آزادی رائے کی ہمیشہ تائید کی اور اپنے طرز پر آئندہ بھی کرتی رہوں گی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس تقریر کے موقع پر انا مری شمل پر کچھ ایسا ہی دباؤ تھا جیسا ان لوگوں کا دباؤ ہوتا ہے جنھیں اساس پرست fundamentalist کہا جاتا ہے۔ ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد۔

شمل نے اپنے اس خطبے میں یہ بتایا کہ مغرب میں اسلام کی ایک یک رخی تصویر ہے جو اسلامی تہذیب کی اس وسعت اور تنوع کو اپنے دائرے سے خارج کر دیتی ہے جو جو ایران وعرب

سے ہندوستان اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے۔ شمل نے یہاں ادب اور شعر کی قوت اور معنی خیزی کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ میں نے استامبول جیسے لاجواب شہر کو ان اشعار کے ذریعہ دریافت کیا جو پانچ صدی سے پہلے تخلیق ہوتے رہے ہیں اور پاکستان کے کلچر کو اسی شعر کے ذریعہ سمجھا جو اس ملک کے کونے کونے میں گونجتا ہے۔ شمل اسلام کے صوفی قلب کو جانتی تھیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تصوف غفلت اور Obscurantism نہیں ہے جیسا مغرب میں بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ وہ ابتدائی صوفی ہی تھے جنھوں نے ناانصافی اور سیاسی جبر کے خلاف اپنی بے خوف آواز اٹھائی شاہوں کو للکارا

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق  یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

اس صوفی روایت کی سب سے اونچی چوٹی پر شمل نے منصور حلاج اور دار کو دیکھا ہے۔ ان کی اس بات پر میر کا شعر یاد آتا ہے کہ:

موسم آیا تو شاخ دار پر میرؔ  سرِ منصور ہی کا بار آیا

خیر یہ داستان نہ صرف دراز بلکہ پیچیدہ بھی ہے۔ اسے یہیں چھوڑتے ہیں۔ شمل کا علمی ادبی کارنامہ اتنا وقیع اور وسیع ہے کہ اس پر فی الحال بات نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے ایک دفتر چاہئے۔ ان کا وہ کام الگ ہے جو کہ ترکی سندھی اور ان کی اپنی زبان جرمن میں ہے۔ شمل کے ہیسکنس Haskins لکچر کے دو تین جملے بہت اہم ہیں جو میں یہاں دہراتا ہوں۔ ''میری دائرہ در دائرہ زندگی علم کی مسلسل جستجو میں گزری ہے..... علم میرے لیے اسی وقت علم ہے جب وہ تجربے، دانش مندی یگانگت اور پختگی میں ڈھل جائے۔ شمل نے تاریخ کے واقعاتی مدوجزر کے ماورا ایک ابدی قوت کو محسوس کیا ہے۔

لکھتی ہیں:

".....One tends (at least I do) to look out for the unchanging power behind the fluctuating surface of events."

شمل کی ایک اور بات میرے دل کو لگی کیوں کہ عرصے سے میرا بھی یہی خیال رہا ہے

انھوں نے یہ بات مذاہب کے مظاہری Phenomenological مطالعے کے ضمن میں کی ہے۔ ان کے خیال میں مذاہب کے مطالعے کا یہ طریقہ یا approach ایسا ہے کہ اس کے ذریعے آدمی آہستہ آہستہ مذاہب کی روح تک پہنچ سکتا ہے۔ میں ان کا جملہ دہراتا ہوں:۔

" I was and still am convinced that such an approach can lead to much needed tolerance without losing oneself in sweeping, dangerous "syncretistic" views that blur all differences."

شمل نے مزید لکھا ہے کہ ان سے لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ کیا ایسی زندگی جو ٹائپ رائٹر، کتابوں اور لکچروں کے درمیان گزرے تھکانے والی نہیں ہوتی؟ ان کا جواب یہ ہے کہ ہاں ہوتی ہے لیکن کسی لکچر کے بعد ناشتے، لنچ یا ڈنر پر جو تخلیقی اور خیال آفریں گفتگو ہوتی ہے وہ زندگی میں ایک لطف اور نیا ولولہ پیدا کر دیتی ہے۔ ایک سوال البتہ ایسا ہے جس سے وہ ہمیشہ جھلا اٹھتی ہیں۔ وہ یہ کہ آپ کو ایک عورت ہونے کے باوجود اسلام سے کیسے دل چسپی پیدا ہوئی؟ گویا اسلام اور عورت ایک دوسرے کے منافی ہیں۔

آخر میں ایک شام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اپنے ماحول اور فضا کی وجہ سے نہ صرف یادگار تھی بلکہ اس میں انامری شمل کی شخصیت کا پرتو شامل تھا۔ غالباً ۸۶ء کی بات ہے جب آخری بار شمل یہاں آئی تھیں۔ انھوں نے اپنی طرف سے چند لوگوں کی دعوت کی اور میری خوش قسمتی کہ مجھے بھی ان میں شامل کیا۔ یہ دعوت انھوں نے پرانی حویلی میں دی تھی اور کھانے کا انتظام محترم مجیب یار جنگ کے حوالے تھا۔ جن سے شمل کی بڑی دوستی تھی۔ شام گہری ہو چکی تھی جب میں اور میری بیوی قانتہ آٹو میں بیٹھ کر پرانی حویلی کے وسیع احاطے میں داخل ہوئے نیم تاریکی اور درختوں کے ہولے۔ ایک عجیب ویرانی سی تھی۔ آٹو چلتا رہا اور بالآخر جب منزل پر پہنچے تو پرانی حویلی ایک جناتی محل لگ رہی تھی۔ مجھے یاد ہے شمل نے یہی لفظ استعمال کیے تھے۔ حویلی کا صرف بیرونی برآمدہ کھلا تھا۔ صرف چند لوگ جمع تھے، ڈاکٹر اور مسز شکیب، ڈاکٹر فیاض قادر اور ان کی جرمن بیوی، مجیب یار جنگ کی بھاری بھرکم، پروقار شخصیت کچھ اور لوگ، بس کوئی آٹھ دس۔ روشنی

یہاں بھی مدھم تھی اور اس وسیع برآمدے کے ایک کونے میں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ کھانا شروع ہوا، اتنا لذیذ کہ ہم نے شاید ہی کبھی کھایا ہو۔ کھانا ختم ہوا تو موسیقی کی باری آئی۔ ساز کھلے اور قوال کی دلکش آواز ابھری۔ شمل نے سراج اورنگ آبادی کی مشہور غزل کی فرمائش کی:

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو میں رہا نہ تو تُو رہا جو رہی سو بے خبری رہی
چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نیم تاریکی اور پرانی حویلی کی اتھاہ خاموشی یہ غزل ہم لوگوں کے دل و جان پر چھا گئی۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ صوفی کا روحانی تجربہ کیا ہوتا ہوگا۔ شمل خاموش بیٹھی سنتی رہیں محویت ان کے مزاج میں تھی۔

یہ تھیں آنا ماری شمل اورینٹلسٹ، اسلامالوجسٹ، ماہر اسلامیات، عالم بے بدل لیکن ان سب سے زیادہ "الفقیرہ الی رحمۃ ربّی"۔

○○○○○

## شمل کی ایک نظم

ترجمہ: پروفیسر سید سراج الدین

# میں جانتی ہوں

میں جانتی ہوں
کہ بُرُج کے درخت قونیہ میں نہیں ہوتے
وہ تو شمال میں سرماشیا کے گھاس کے میدانوں
یا اپ اسٹیٹ نیویارک میں اگتے ہیں
اور ایک پھیکے آسمان تلے ملگجے نالوں میں
اپنا عکس دیکھتے ہیں
مگر میں جانتی ہوں
کہ مولانا نے کیا کہا ہے
''تیری حسین اور خشک زلفوں کے سائے میں
میرا دل اس طرح محوِ خواب تھا جیسے درخت
کے سایے میں مٹی''
مٹی جس سے گھاس اُگے گی
تیرے حلم اور نرمی کی تحسین کرنے
ہیدرا گے گا
تیرے جمال کے گیت گانے
(جس میں میرے خونِ ناب کا رنگ ہوگا)
مٹی جو ایک دن،
اے درویش بُرُج
تیرے ان پتوں سے ڈھک کر
سنہری ہو جائے گی
جنھیں تو اس لیے گرا دے گا
تا کہ تجھے عریانی
فقر، پاکی اور محبت حاصل ہو
اب صرف تیری عریاں شاخیں ہیں
اور یہ مدھم آسماں
اور وہ جنگلی پرندے جو جاڑوں کی راتوں میں
ایک بے خانماں پرواز کرتے ہیں
تیرے پاس سے گذرتے ہوئے
تجھے اپنا سلام بھیجیں گے
اور میں تیرے قدموں کے پاس کی خاک
تیری حفاظت کروں گی
بہار کی آمد کی دعا مانگتی.....

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب

# انمیری شیمل

انمیری شمیل ایک نابغہ روزگار شخصیت کی حامل تھیں۔ ان کا شمار عالمی سطح پر صف اول کے محققین میں ہوتا تھا۔ ان کی تحقیقات کا مرکز اسلامی تاریخ وتہذیب اور خاص کر صوفیانہ ادب تھا۔ ان کو بیشتر اسلامی زبانوں پر زبردست دستگاہ حاصل تھی۔ ان زبانوں میں عربی، فارسی، ترکی، سندھی، اردو، دکھنی، تاجیکی اور ازبکی کے علاوہ یورپ کی بھی اہم زبانیں شامل ہیں۔ ہر سال ان کی ایک سے زیادہ ضخیم ٹھوس، تحقیقی کتابیں شایع ہوتی تھیں۔ انھوں نے ایک سو پچاس سے زیادہ کتابیں اور بلاشبہ کئی ہزار مضامین لکھے اور تقریریں کیں۔ وہ کم از کم دس زبانوں میں گفتگو بھی کرتی تھیں اور انھوں نے اِن زبانوں میں لکھا بھی ہے۔ ان کی اہم تصنیفات جرمن، ترکی اور انگریزی میں ہیں، جو شایع ہو چکے ہیں۔ ان کے سینکڑوں مضامین اور چند کتابیں ابھی زیر طبع ہیں۔ ان کی قریبی دوست پروفیسر گڈرن شوبرٹ Gudrun Sohubert ان کی اشاعت کی کوشش کر رہی ہیں۔

پروفیسر انمیری شیمل ۷/اپریل ۱۹۲۲ء کو جرمنی کے ایک گانو اِرفرٹ Erfurt میں پیدا ہوئی تھیں۔ ابھی وہ اسکول کی طالبہ ہی تھیں کہ اُن کو ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی تاریخ سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں انھوں نے ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی تاریخ ایک خوب صورت نوٹ بک میں اس طرح لکھی کہ بیان کے ساتھ ہر بادشاہ کی نہایت خوب صورت چھوٹی سی تصویر بھی اسی طرح بنائی جس طرح حیدرآباد میں اسکول کی کتابوں میں ہوا کرتی تھیں۔ ان کی تصویروں مس سارے بادشاہ رنگین لباس پہنے ہوئے ہیں۔ یہ شائع تو نہیں ہوئی لیکن ایک دفعہ جرمنی میں جب میں ان کے یہاں مقیم تھا تو انھوں نے مغلوں سے اپنی دلچسپی کی داستان بھی سنائی اور وہ نوٹ بک بھی دکھائی۔

انھوں نے پہلی ڈگری جرمنی ہی سے حاصل کی جو عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر مشتمل تھی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ۱۹۴۱ء میں برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا دوسرا ڈاکٹریٹ تاریخ مذہب میں ۱۹۵۱ء میں یونیورسٹی آف ماربرگ سے تھا۔ ۱۹۴۶ء سے

۱۹۵۴ء یعنی آٹھ سال تک انھوں نے یونیورسٹی آف ماربرگ University of Marburg میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ تئیس 23 سال کی عمر میں وہ صدر شعبہ عربی واسلامیات مقرر ہوئیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی حکومت میں انھیں لازمی طور پر فوج میں بھرتی ہونا پڑا۔ فوج میں ان کی خدمات ایک مترجم کی حیثیت سے لی گئی تھیں۔ اس وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں وہ لکھتی ہیں کہ اس فوجی خدمت میں بھی عربی مراسلوں کا ترجمہ کرنے میں انھیں بڑا لطف آتا تھا۔

کئی ڈگریوں کے حاصل کرنے کے بعد اُن کا علمی ذوق اور بڑھ گیا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ ایک تحقیقی پروجکٹ لے کر ترکی پہنچیں۔ وہ خود لکھتی ہیں کہ جرمنوں کی خشک مزاجی اور بیگانہ پن کی نسبت ترکی کی گرم جوش اور محبت بھری فضا ان کو بہت اچھی لگی۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں جامعہ انقرہ نے انھیں دینیات اسلامی وتاریخ مذاہب عالم کے صدر شعبہ کی کرسی پیش کی جس کو انھوں نے بخوشی قبول کیا۔ اس وقت انمیری شیمل کی عمر صرف تیس سال تھی۔ جامعہ انقرہ میں وہ پانچ سال تک کارگزار رہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب قونیہ میں جلال الدین رومیؒ کی مزار پر اکثر جایا کرتیں اور رومیؒ سے ان کی دلچسپی اور نتیجتاً رومیؒ کا مطالعہ بڑھا۔

ترکی میں رہنے کی وجہ سے ترکی ان کی اپنی زبان بن گئی۔ آج بھی ترکی کی جامعات میں ان کا نام نہایت فخر سے لیا جاتا ہے۔ وہاں ان کے رفقاء احباب اور شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔

۱۹۶۰ء میں وہ اپنے وطن جرمنی واپس آگئیں۔ اس مرتبہ انھیں University of Bonn نے عربی اور اسلامیات اسوسی ایٹ پروفیسر کا عہدہ پیش کیا۔ جس پر وہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک کارگزار رہیں۔ ان کی ان ملازمتوں کے ساتھ ساتھ مختلف بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت، مضامین اور کتب کی اشاعت کی وجہ انمیری شیمل کی شہرت ممالک اسلامی اور یوروپ کے علاوہ امریکہ تک پہنچ چکی تھی۔

۱۹۶۶ء میں انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی میں ابتداً ہند اسلامی تہذیب کے لکچرر کا عہدہ قبول کیا جس پر وہ چار سال تک کارگزار رہیں پھر اسی شعبے میں پروفیسر مقرر کی گئیں۔ ہارورڈ میں بیس سال تک وہ ہند اسلامی تہذیب کی پروفیسر رہ کر وہ ۱۹۹۲ء میں اپنی خدمات سے سبک دوش ہوئیں۔ ستر سال کی عمر کو پہنچنے تک انھوں نے تدریس کے علاوہ بہت ساری تصنیفات مکمل کر کے شائع کر لی تھیں لیکن اب بجائے آرام کے انھوں نے اپنا تحقیقی سفر اور تیز کر دیا۔ اب تو ہر سال دو

دو تین کتابیں شائع ہونے لگیں۔ ہر کتاب ایسی جو کئی کئی برس کی محنت کا نتیجہ تھی۔ یہ انمیری شیمل کا وصفِ خاص تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں مختلف کتابوں کا خاکہ ذہن میں تیار کرتیں اور ان کے لئے مواد جمع کرتی رہتیں اور اچانک کسی ملاقات میں گفتگو کے دوران نہایت نرم لہجے میں کہتیں کہ ہاں فلاں موضوع پر اب میری کتاب کا مواد پورا مل چکا ہے۔ یا میں نے فلاں موضوع پر کتاب لکھ ڈالی ہے۔ یہ اعلانات ہر تیسرے چوتھے مہینے ہوتے رہتے اور سننے والے حیران رہتے۔

۱۹۹۲ء میں انھوں نے ایڈنبرا میں گفرڈ Gifford لکچرز دئے تھے۔ جو ۱۹۹۴ء میں

Deciphering the Signs of God : A Phenomenological Approach to Islam

یعنی آیات کونیہ کے وسیلے سے اسلام کی تفہیم کے موضوع پر یونیورسٹی آف نیویارک سے شائع ہو چکی ہے۔

اسی زمانے میں ان کی زندگی کے بارے میں ایک مختصر لیکن جامع رسالہ A Life of Learning شائع ہوا تھا جس کا ترجمہ علی محمد صاحب، نے کیا جو رسالہ 'سب رس' حیدرآباد دکن میں شائع ہو چکا ہے۔ اس رسالے کی اشاعت کے بعد ان کی متعدد غیر معمولی تصنیفات شائع ہوئیں۔ جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

| | |
|---|---|
| The Two Coloured Brocade | ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ |
| My Soul is Woman | اسلام میں عورت کے موضوع پر |
| Lyrics for the Divine Soul | صوفیانہ شاعری کا نہایت دلکش جائزہ |
| The Mystry of Numbers | مذاہب عالم اور اسلام میں اعداد کی اہمیت |

ان انگریزی کتابوں کے علاوہ جرمن زبان میں ''اسلام میں خواب اور تعبیر خواب'' ہندوستان کے عہدِ مغلیہ کی تاریخ '۱۹۴۲ء کے بعد کی اپنی خودنوشت سوانح 'سفرنامۂ ہند، ودکن۔

وہ ہر سال اپنی ڈائریوں پر مبنی جرمن زبان میں ایک جرنل لکھا کرتی تھی جو کافی ضخیم ہوتا اور اس میں سال بھر کی روداد ہوتی۔ اسی طرح بعض سفرنامے لکھے۔ یہ جرنل اور سفرنامے نہایت قریبی دوستوں کو بھیجے جاتے۔ ان کی اشاعت ہو تو انمیری شیمل کی زندگی کے ساتھ ساتھ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑے گی۔

پروفیسر شیمل کی تصنیفات کی ایک مکمل بیلوگرافی ڈاکٹر اکرام چغتائی نے ۱۹۹۸ء میں شائع کی تھی۔

انمیری شیمل ایک جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت اعلیٰ درجے کی انسان تھیں۔ اُمورِ علمی سے ہٹ کر بھی ان کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ دنیا بھر میں ان کے دوست احباب بکھرے تھے۔ لیکن وہ شاید ہی کسی کو بھولتی ہوں۔ ایک دفعہ وہ اس وقت حیدرآباد تشریف لائیں جب میں لندن میں تھا۔ اس سفر کے بعد جب وہ لندن تشریف لائیں تو سفرِ حیدرآباد کی روداد نہایت دلچسپ طریقے پر بیان فرماتی رہیں۔ اس سلسلے میں مختلف احباب کے نام بھی لیتی جاتی تھیں۔ پروفیسر سراج الدین کو بھی بہت چاہتی تھیں۔ ان سے ملاقاتوں کا ذکر فرمایا۔ میں نے پوچھا مضطر مجاز نہیں ملے' کہنے لگیں کہ میری تقریروں میں ہر جگہ دکھائی دیئے لیکن دور دور رہے' مجھ سے آکر نہیں ملے' پتہ نہیں کیوں؟

حیدرآباد ان کو بے حد پسند تھا۔ چار مینار پر انھوں نے ایک خوب صورت نظم بھی کہی۔ حیدرآبادی بریانی' بگھارے بیگن' شکم پُر اور خاص طور پر ''گل بہشت'' ان کو بے انتہا پسند تھے۔ انھوں نے اپنے سفرنامہ دکن میں جو جرمن زبان میں نہ صرف ان چیزوں کی تعریف کی ہے بلکہ میری بیوی فرحت شکیب سے دریافت کر کے ان کے مکمل نسخے اور پکوان کے طریقے بھی اس میں درج کر دیئے ہیں۔ ''گل بہشت'' یا ''گل فردوس'' پہلی دفعہ انھوں نے مخدومی سجادہ صاحب گلبرگہ مدظلہ کے دولت خانے پر نوش فرمایا تھا۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کی کی عمارتوں پر انھوں نے نظمیں کہیں جو ان کے مجموعہ ہائے منظومات میں شامل ہیں۔ ان کو نہایت اعلیٰ درجے کے اردو' فارسی' عربی' ترکی اور مختلف زبانوں کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا آنے والے چند مہینوں میں آپ کا کیا پروگرام ہے۔ اس پر کچھ دیر سوچ کر خواجہ میر دردؒ کا یہ شعر پڑھا۔

مانندِ فلک دل متوطن ہے سفر کا
معلوم نہیں اس کا ارادہ ہے کدھر کا

میں نے محمود گاوانؒ کے مزار کی تصویر کھینچی۔ تصویر میں آسمان، ایک درخت اور اس کے نیچے ایک چبوترے پر گاوان کی مزار ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس پر کچھ لکھ دیجئے۔ قلم برداشتہ آتش کا یہ شعر لکھ دیا ؎

خُدا دراز کرے عمر چرخِ نیلی کی
کہ بیکسوں کی مزاروں کا شامیانہ ہوا (آتش)

میرا ان کا کوئی پچیس برس کا رابطہ رہا' ان سے ہندوستان' انگلستان' جرمنی اور امریکہ کے مختلف مقامات پر ساتھ رہا۔ کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کسی تکلیف پر شاکی ہوں یا انھیں کسی بات پر غصہ آیا ہو۔ وہ بہت ہی صابر و شاکر قسم کی انسان تھیں اور ان کی حسِ مزاح بہت تیز تھی۔ ناگوار سے ناگوار واقعہ پر وہ ضرور کوئی لطیفہ بیان کر دیتیں۔ ایک دفعہ کی بات ہے کہ ہم لوگوں کو کہیں جانا تھا۔ موٹر کار میں پانچ کی جگہ تھی اور ہم سب چھ افراد تھے' جن میں انمیری شیمل بھی تھیں' ہم نے کہا اس طرح سفر کرنے میں آپ کو تکلیف ہوگی۔ کہنے لگیں ''آپ فکر نہ کریں کراچی میں ایک دفعہ ہم چودہ لوگوں نے ایک ہی V.W Beitle میں سفر کیا ہے''۔

میں نے یورپ اور امریکہ میں آج سے بیس سال پہلے بہت لوگوں کو اُن کا مخالف پایا لیکن وہ مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کے مقابلے میں بونے نظر آنے لگے۔ وہ آخر دم تک کام کرتی رہیں۔ ۱۳ر جنوری کو وہ بون میں تھیں۔ میری اُن کی فون پر بات ہوئی۔ گھر کے ہر ایک فرد کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ غالباً ۱۷ر جنوری کو اطلاع ملی کہ وہ غسل خانے میں گر پڑیں اور بے ہوش ہیں۔ دواخانے شریک کر دیا گیا۔ یہ بے ہوشی کئی دن رہی۔ ہوش آنے پر اُن کا ایک اور آپریشن کرنا ضروری تھا۔ ۲۴ر جنوری کو اُنھیں ہوش آ گیا۔ سب سے پہلی بات جو انھوں نے کہی وہ یہ تھی کہ میری کتاب کا آخری باب ادھورا رہ گیا ہے' میں چاہتی ہوں کہ کوئی اس کا ڈکٹیشن لے لے۔ پھر انھوں نے ڈکٹیشن دے کر اُس کتاب کو مکمل کر دیا۔ یاد رہے کہ آخری زمانے میں وہ مسلم خواتین شعراء پر کتاب لکھ رہی تھیں جس میں ساری دنیا کی مسلم خواتین شعراء شامل ہیں۔ یہ آخری باب اُزبکستان کی خاتون شعراء کے بارے میں تھا۔ ۲۶ر جنوری کو اُن کی اجازت سے اُن کا آپریشن کیا گیا جو افسوس ہے کہ ناکام ہو گیا۔ تاریخ کی یہ نابغہ روزگار شخصیت ۲۶ر جنوری کو رات کے بارہ بجے ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئی۔ ۴ر فروری کو بون میں اُن کو سپردِ خاک کر دیا گیا ..... اِنا للّٰہِ وَاِنّا الیہ رَاجِعُونَ۔ مجھے جنازے میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔ دنیا بھر سے کوئی پانچ سو افراد نے شرکت کی جن میں یورپ' انگلستان' امریکہ' روس' ترکی' مصر' سوڈان' سعودی عرب کے اسکالرس کے علاوہ بعض اربابِ اقتدار بھی تھے۔ ایسی شخصیت پتہ نہیں کتنی صدیوں بعد پیدا ہو۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

○○○○○

محمد ظہیر الدین

# اقبال اکیڈیمی میں پروفیسر شمل کے لکچرس۔ چند یادیں

پروفیسر اناماری شمل کی شخصیت ان کے علمی تبحر اور مختلف موضوعات پر ان کی عالمانہ نظر کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ اس شمارہ میں شامل مضامین سے ہوگا۔ یہاں میں اپنی گفتگو کو پروفیسر شمل کی اقبالیات سے دلچسپی اور حیدرآباد میں ۵ مرتبہ اُن کی آمد کا انتہائی اختصار سے تذکرہ کروں گا۔

پروفیسر اناماری شمل اکتوبر ۱۹۷۹ء کو پہلی بار حیدرآباد تشریف لائیں۔ وہ میکس ملّر بھون کی دعوت پر یہاں آئیں۔ ان کو مدعو کرنے مختلف علمی مراکز میں' ان کا پروگرام مرتب کرنے اور لکچرس کے اہتمام میں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب کی مساعی اور دلچسپی کا خاص دخل ہے۔ ۱۹۷۹ء میں ان کے عالمانہ لکچرس نے گہرے نقوش چھوڑے۔ ۱۹۷۹ء کے علاوہ ۱۹۸۰ء' ۱۹۸۱ء' ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۶ء میں بھی حیدرآباد میں ان کے لکچرس کا اہتمام کیا گیا۔ ہر موقع پر وہ خصوصیت کے ساتھ اقبال اکیڈیمی بھی تشریف لائیں۔ جس کی تفصیلات پیش کی جارہی ہیں۔

''خبر'' اور ''نظر'' کا اعلیٰ امتزاج ان کے ہر لکچر کی خصوصیت تھی۔

پروفیسر شمل نے لکھا ہے کہ اقبال سے ان کی دلچسپی مشہور جرمن شاعر گوئیٹے اور مولانا رومی کی وجہ سے ہوئی۔ گویا وہ بھی اس قافلہ شوق کی راہرو تھیں جس کے سالار رومی ہیں۔ اقبالیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ اقبال گوئیٹے سے بڑے متاثر رہے۔ ''پیام مشرق'' انھوں نے گوئیٹے کے ''دیوان مغرب'' کے جواب میں لکھی۔ پیام مشرق کی حسین نظمیں ''جوئے آب'' (نغمۂ محمد ﷺ) ''حور و شاعر'' گوئیٹے کی نظموں کی دلکش ترجمانی ہیں۔ اقبال کے ''فاوسٹ'' کا اثر اقبال کی فکر میں ملتا ہے۔ مولانا رومی تو اقبال کے مرشدِ معنوی تھے۔

اقبالیات میں پروفیسر شمل کا کارنامہ ان کی کتاب Gabriel's Wing (شہپر جبریل) ہے جو اقبال کے مذہبی افکار سے متعلق ہے۔ اقبال کے حوالہ سے انھوں نے اسلام کے عقائد' ارکان وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے اس ایک جملہ سے اس کتاب کے نام کی وجہ تسمیہ اور اقبال سے ان کی گہری عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

" No body would assert that he (Iqbal) was a prophhet but one may assert that he has been touched by " Gabriel's Wing"

اس بلند پایہ کتاب کے علاوہ انھوں نے جاوید نامہ کا منظوم اور نثری ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ توضیحات کے ساتھ انھوں نے جاوید نامہ کا ترکی میں بھی ترجمہ کیا۔ بانگِ درا سے ارمغانِ حجاز تک انھوں نے اقبال کا انتخاب شایع کیا اور اقبال پر کئی عالمانہ مقالات لکھے۔

اقبال اکیڈیمی کی مساعی سے پروفیسر شمل بڑی متاثر ہوئیں۔ چنانچہ اس کا اظہار ان کی اس رائے سے ہوتا ہے:

''اقبال اکیڈیمی حیدرآباد میں میری آمد انتہائی مسرت کا باعث ہوئی۔ اس ادارہ کی مختلف سرگرمیوں، اس کے کارکنوں کے اعلیٰ ذوق اور جوش وخروش سے میں بہت متاثر ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ دنیا میں جہاں کہیں اقبال سے متعلق کسی جلسہ میں شرکت کروں گی، میں اس اکیڈیمی کا ضرور تذکرہ کروں گی۔ مجھ سے جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس ادارہ کے لئے اقبال پر اپنی تصانیف بھیجنے کی کوشش کروں گی۔ آپ نے جس خلوص اور گرمجوشی سے میرا استقبال کیا ہے، اس میں، میں علم اور عشق کے امتزاج کی کیفیت محسوس کرتی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔ مہکتی ہوئی تمناؤں کے ساتھ''۔

انا ماری شمل

پروفیسر سید سراج الدین صدر اقبال اکیڈیمی سے ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ پروفیسر سراج کی علمیت کی مدّاح تھیں۔ جب وہ پہلی مرتبہ حیدرآباد آئیں تو پروفیسر سید عالم خوندمیری بقیدِ حیات تھے۔ ان کے انتقالِ پرملال کے بعد جب وہ دوبارہ حیدرآباد آئیں تو پروفیسر عالم کی کمی کا خاص طور پر تذکرہ کیا۔ ایسی نابغہ روزگار شخصیت کے کارناموں پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ ان کی چھوڑی ہوئی تصانیف، ان کی عظمت کا احساس دلاتی رہیں گی۔

○○○○○

## Visits of Prof. Dr. Annemarie Schimmel & Lectures at Iqbal Academy, Hyderabad

**(1) First Visit 1979** (28th Oct to 5th Nov)

3-11-79 -- Iqbal as seen by a Historian of Religion,
Presided by Dr. S.Alam Khundmiri

4-11-79 -- Iqbal-East & West(Siminar at OU)
Speakers
1. Prof. Khundmiri
2. Prof. Siraj
3. Prof. Taqui Ali Mirza

Presided by Prof Schimmel

**(2) Second Visit** 1980 (21st Oct to 26th Oct)

25-10-80 -- A Visit to Thatta (Sindh)

26-10-80 -- Iqbal's Poem on the Golconda Tombs
Presided by Prof. Siraj

**(3) Third Visit 1981** (22nd Oct to 30th Oct)

27-10-81 -- Goethe's Reception of Oriental Themes

30-10-81 -- Friedrich Rukert – Poet & Orientalist – Extra Ordinary
Presided by Prof. Siraj

**(4) Fourth Visit 1983** (26th & 27th Oct)

26-10-83 -- Iqbal – Interpretation of the Quranic Prophets
Presided by Prof. Siraj

**(5) Fifth Visit** (24th Oct to 26th Oct)

26-10-86 -- Iqbal, Rimi & Sufis
Presided by Prof. Siraj

*Professor Ismath Mehdi*

# ANNEMARIE SCHIMMEL : ON DECIPHERING THE SIGNS OF GOD

Annemarie Schimmel, whom we are remembering today, has been a larger than life scholar in the great tradition of German scholarship. Schimmel's spanned centuries of Islamic learning to make her an authority on the literary heritage of different Islamic peoples – Turkish, Arabic, Persian, Urdu, Sindhi and Pashto. Plus this was a connoisseur of music and arts of these peoples and was a superb exponent of calligraphy.

Her comprehensive treatment of any subject she undertook, was deeply layered and her canvas ranges from her favorite subject Sufism to great poets of the Muslim world, to aesthetic and refined studies of Islam, in books numbering 105 and countless articles and monographs. She composed poetry in several languages and her last work is her autobiography.

I met her alas, only a few times and cannot say with pride *"Jamal-e-hamnashin dar man asar kard"* However, during the brief contact with her I learnt a lot. Once when she was being introduced, the speaker went on and on, and I was getting fidgety. She noticed me and gave me a paper and said practice your calligraphy. From then on lectures are never boring for me!

Perhaps her greatest contribution has been to interpret Islam and Islamic culture not only to the West or whom her writing was mainly intended but also for many of us who have grown up in the glare of Western culture and

have grown up with great ignorance about our own roots, our wisdom and our philosophy.

Schemmel's interpretation is not a hard dry presentation of the facts that we normally associate with religious books, but it is a pulsating, vibrant and ever expanding account of what makes Islam a great and meaningful religion and what makes Islamic culture appealing. She speaks from the heart whether it be to explain the finer points of sharia or the ecstacy of the Sufis. And her works are interspersed with specimens of calligraphy, that she found so fascinating, and quotations from poets she loved. One of Schimmel's most important books is *Deciphering the Signs of God – A Phenomenological Approach to Islam*. It was published in 1994 and I shall talk about it in some detail as it is the culmination of the work of a life time.

Schimmel takes as her starting point, the simplest 'signs of God': phenomena of nature, like water, plants, animals, and their use in religious and symbolic language. The Quran constantly asks people to look at the signs of God: signs that are hidden 'in the horizons and in themselves': *"sa nurihim ayatina fil afaq wa fi anfusihim"* says the Quran; 41:53. We shall show them our signs in the horizons and in themselves (these words are selected by Annemarie Schimmel and illustrated in different types of calligraphy throughout the book.

Relying on sources of both classical and modern literature, as well as her on her own personal experience of Islam as practiced in its Sunni, Shiite and Sufic manifestations, she enters into the heart of religion. She does this by taking first the natural phenomena and then deeper layers of the human response to the Divine, until the innermost core of religion is reached. Schimmel holds that the highest

spiritual experience can be triggered by a sensual object, a flower, a fragrance or a cloud, reminding us of Saadi:

*Barg-e-darakhtan-e-sabz dar nazar-e-hoshiyar*
*Har waraqi daftar ist marifat-e-kirdigar*

This is part of our consciousness and we do not have to be reminded of it. But the Western modern man sees the universe as meaningless. So Schimmel explains to them the meaning. Phenomena of nature and all the signs around us are to be treated with respect precisely because they are in their essence, majestic. *Dhul jalal*. At the same time they are in themselves nothingness in relation to the transcendent reality. DGS is a study therefore of the religion of majesty and humanity, a study in its spiritual rather that legal reality.

The signs of God that the Quran repeatedly refers to, are the phenomena of the natural world. They include the alternation of the seasons, as also of day and night, the sun and the stars.

It is obvious that these 'signs', cannot be deciphered in the way mathematical formula are deciphered. They are to be experienced rather than analysed.

At the same time everything in the world including events and our own inward status has meaning and can therefore be seen as a 'sign' pointing back to its Creator, its Source. Everything, therefore is potentially a reminder of God.

For a comprehensive treatment of any subject we normally say it is an indepth study. I would say that Schimmel's treatment is a deeply layered one of the signs, her canvas covering objects as wide apart as stones and man's soul.

How are the signs presented? Each *ayat*, each sigh is first given as it is in the Quran, then in Hadith and more often in mystical Hadith, and in the literature and folklore of different Muslim countries.

The first chapter is called "sacred aspects of nature and culture". And to give the flavour the book I will give samples of how she treats her subject.

She starts with inanimate nature - with stones: Since time immemorial, man has seen stones, which never seemed to change, and has taken them to be signs of eternal strength. She connects mythological references to a rock in the cosmos whose central point on earth is the *Kaaba*. The black stone – a meteor – in the south eastern corner of the *Kaaba* is the point to which believers turn and which they try to kiss during their pilgrimages as a mystical Hadith claims;
"The Black Stone is God's right hand"
Extremely sacred next to the *Kaaba*, is the Dome of Rock in Jerusalem – *Qubbat us saqra* – All the prophets rested there, it is said, and the Prophet is Islam (SAWS) met with them at the beginning of his heavenly journey to perform prayer on this very spot. The stone beneath the actual dome is blessed by Prophet Muhammad's (SAWS) footprint and some traditions even claim that the rock hangs free in the air.

Not only in Jerusalem can one see the imprint of the Prophet's (SAWS) foot *qadam-e-rasool*. Schimmel mentions the many countries where such stones are found from Tunisia to Turkey. She goes on to describe how Shiah Muslims venerate stones with impressions of Imam Ali's foot. And describes our own Maula Ali "as situated

on top of a steep rock near Hyderabad Deccan where one can admire an immense footprint".

Symbolism in stones is described. For instance Maulana Rumi compares the lover to a marble rock that reverberates with the beloved's words and echoes them. Even more important is Ibn Arabi's idea that the Prophet is a *hajar bath*. Pure stone on which the Divine message was imprinted as it were-an idea that continued through the centuries and which is prominent in the work of Shah Waliullah.

Stones are mentioned as expressing the divine wrath: such as stoning of Disobedient peoples (*Suratul fil*, for example, *"tarmihim bi hijaratin min sijjil"*)

The stoning of the devils during haj, and the point that *Shaytan* is always referred to as *rajim* (stoned). The positive qualities of precious stones are detailed and what The Prophet (SAWS) said about them, and how poets sang about them. Then coming to mountains to *Tur-e-Sina*, Mt, Sinai, where Prophet Moses spoke with God. Then comes the point:

Mountains are nothing in God's omnipresence: they prostrate themselves before God along with all other creatures:

Mt. Sinai was shattered by the manifestation of Lord's grandeur.

From stones to dust, its uses, its sanctity, its cleansing powers, to water whose role is more central in man's life. (*wa ja'alan min-al mai kulla shayin hay,*). "We have made everything alive through water."

Water is constantly quivering and moving – that is its act of exalting the Lord in unison with all other creatures beautiful thought.

Everything comes to God as a slave in total humility. Natural phenomena and all the 'signs' around us are to be treated with respect because they are majestic *dhul jalal*. At the same time they are in themselves nothingness in relation to the transcendent reality and to worship them as ends in themselves is the ultimate sin. What is the lesson we learnt from water?

Water reminds us that there is one real existence which takes many different forms, just as water – being formless in itself – many be found in the form of ice, rain droplets or steam.

There is a chapter entitled "The World and the Script". A further reminder of God's constant and eternal presence is the recitation of the Quran and in this chapter, the author discusses the rules which apply to this recitation. The Quran is brought to life and the revelation is renewed through recitation. The meaning of the verses – themselves called *ayat* (signs) is only one aspect of the Book's living reality. The interweaving of words sounds and meaning is what constitutes the Quran in its real presence.

A final quotation from "Deciphering the Signs of God" sums up the central theme of Schimmel's work: for the pious Muslim, Islam shows itself everywhere in the universe – in the blood circulation, the movement of the stars in their orbits, the growth of plants – everything is bound by Islam, surrender and subordination to the divinely revealed law.

Schimmel ends her book by quoting Maulana Rumi who can, in her opinion, perhaps answer the human mind's never ending question, as to how to reach Him who is the Merciful, and the Powerful, the Inward and the Outward, the First and the Last the one who shows Himself through signs and can never be comprehended:

After giving the metaphor of the *shama & parvana*... Moulana Rumi says:
The human being who can live without God and does not undertake any effort is not a real human being; but if one could comprehend God, then that would not be God. That is the true human being: the one who never rests from starving and who wanders without rest and without end around the light of God's beauty and majesty *jamal* and *jalal*. And God is the One who immolates the seeker and annihilates him and no reason can comprehend Him.

Reading Annemarie Schimmel becomes an absorbing passion: One feels in front of an evolved presence. Annemarie Schimmel according to me should have been called Annemarie Miracle.

If I could I would have asked Schimmel why did she choose the word God in her title.

Vol : 12 Issue : 2
November 2003

ISBN : 81-86370-24-2
Phone: 55663950

# " IQBAL REVIEW "

## (JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY, HYDERABAD)

IQBAL ACADEMY

*Gulshan-e-Khaleel, 10-5-7/1, Masab Tank, Hyderabad-500 025, A.P. India.*